معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ سو روپئے فی شمارہ دس روپئے

پاکستان میں سالانہ دوسو پچاس روپئے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحیٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY , AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵% ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۶۹ ماہ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۰۲ء عدد ۴

فہرست مضامین

مقالات

وفیات

شذرات

یہ خیال تو پہلے سے عام تھا کہ مسلمان خوں ریز، سفاک اور جنگ جو ہوتے ہیں ع
بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے۔ لیکن جب سے یورپ کو علم و سائنس میں برتری
حاصل ہوگئی ہے اور ذرائع ابلاغ پر اس کا مکمل قبضہ ہوگیا ہے اس وقت اس نے اپنے زور و بالادستی
اور اعلان و اشتہار کے وسائل سے دنیا کی تمام قوموں اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے دل و
دماغ میں یہ رچا بسا دیا ہے کہ مسلمان تشدد پسند اور دہشت گرد ہوتے ہیں، حدیث، سیرت اور
تاریخ اسلام کی کتابوں سے ایسے واقعات ڈھونڈ لئے گئے ہیں جن کو مسلمانوں کی بے رحمی اور جبر و
قہر کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے، حالانکہ ان سے اپنا مدعا ثابت کرنے کے لئے یا تو ان میں
رنگ آمیزی اور ملمع کاری کی جاتی ہے یا سیاق و سباق اور موقع و محل سے جدا کر کے ان کو اس شکل
میں پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ظلم و جور کی کہانی معلوم ہونے لگتے ہیں۔

۱۱/ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پنٹاگن پر ہونے والے حملے سخت قابل
مذمت اور وحشت و درندگی کا نمونہ ہیں لیکن امریکہ نے اپنی طاقت اور بالادستی کی بنا پر ان کو بعض
ایسے مسلمانوں کے سر منڈھ دیا ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اسی کے پروردہ ہیں، حالانکہ وہ
آج تک اس کا کوئی اطمینان بخش ثبوت نہیں پیش کر سکا ہے، اس نے اس واقعہ میں مسلمانوں کو
ملوث کرنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ اسے بہانہ بنا کر افغانستان کو تہس نہس کر ڈالا اور ابھی تک وہاں
کے بے گناہ اور بے قصور شہریوں پر مسلسل بمباری کر رہا ہے لیکن کس میں ہمت ہے کہ امریکہ کے
جلال و جبروت کی وجہ سے اس کی اس وحشیانہ دہشت گردی اور اس صدی کے سب سے بڑے
پرتشدد اور جابرانہ رویہ کی مذمت کرے جس کی مثال گذشتہ تاریخ میں بھی نہیں ملے گی، امریکہ کو
دوسروں کی دہشت گردی کا تو تنکا نظر آجاتا ہے لیکن اپنی دہشت گردی کا شہتیر بھی دکھائی نہیں دیتا
اور اس کے رعب و دبدبہ کی وجہ سے اکثر ممالک بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔

اسی کی سی کہنے لگے سب اہل حشر　　کہیں پرسش داد خواہاں نہیں ہے

امریکی حملے کے بعد یہ امر مسلمہ سمجھا جانے لگا ہے کہ ہر دہشت گردانہ کارروائی اور ہر
پرتشدد واقعے میں مسلمانوں کا ہاتھ ہوتا ہے، ہمارے ملک پر بھی مغرب کا یہی جادو چل گیا ہے اور
یہاں کی فسطائی جماعتوں اور فرقہ پرست عناصر کو ہر تخریب و فتنہ کے لئے مسلمانوں کو مورد الزام

قرار دیتے ہیں۔

جب کوئی فتنہ زمانے میں اٹھا کرتا ہے　　لوگ اشاروں سے بتا دیتے ہیں تربت میری

ملک کی پارلیمنٹ پر حملہ ہوا اور گودھرا میں کارسیوکوں کی بوگی جلائی گئی، یہ بڑے شرم
ناک واقعے ہیں، مجرموں کو ضرور عبرت ناک سزا دی جانی چاہئے مگر ثبوت و تحقیق کے بغیر ہی ان
کے لئے کیسے مسلمانوں کی جانب انگلی اٹھا دی گئی جس کے بعد نفرت و اشتعال اور انتقام کی ایسی
آگ بھڑکائی گئی جس میں بے خطا و بے قصور لوگوں کی جان، مال اور املاک ابھی تک جل بھن
رہی ہیں، یہ تو کرشمۂ قدرت ہے کہ اس کے مخفی ہاتھ کبھی کبھی اصل حقیقت کو آشکارا کر دیتے اور
الزام اور جھوٹ کی قلعی کھول دیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ع ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا
نکل آیا۔ اڑیسہ میں قدرت نے اصل شر پسندوں کو بے نقاب کر دیا ورنہ پولیس اور فرقہ پرستوں کا
بس چلتا تو اس کا الزام بھی مسلمانوں کے سر تھوپ دیا جاتا۔

ہم مسلمانوں کو دودھ کا دھلا نہیں کہتے، یقیناً بعض ناروا اور پرتشدد واقعات میں کسی
خاص سبب یا اپنی بدبختی سے وہ ملوث ہوتے ہیں جس کا خمیازہ ان کی پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے لیکن
اس طرح کی حرکتیں کرنے والے وہی مسلمان ہوتے ہیں جن کے متعلق اقبال نے کہا ہے ع
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود۔ من حیث القوم، مسلمان اس طرح کی سنگ دلانہ اور
جارحانہ حرکتوں کے مرتکب نہیں ہوتے گو ان میں اب پہلے جیسے ایمانی اوصاف، اسلامی
خصوصیات اور سیرت اور کیرکٹر کی مضبوطی و پختگی نہیں ہے اور نہ وہ اسلام کے تقاضوں اور شرعی
احکام کے کما حقہ پابند ہیں، اس کے باوجود ان کی اکثریت امن پسند ہے جو ظلم و تشدد، دہشت
گردی اور فساد سے نفرت کرتی ہے، اور خال خال تو اس قوم میں ایسے برگزیدہ اور مقدس لوگ بھی
ہیں جو اشک سحرگاہی سے وضو کرتے ہیں، اگر وہ پانی کی دعا مانگیں تو جل تھل ہو جائے، کیا چند نام
کے مسلمانوں کی حرکتوں کی سزا ان سب لوگوں کو دی جائے گی اور گودھرا کے واقعہ کا بدلہ پورے
گجرات کے بے قصور مسلمانوں سے لیا جائے گا کیا یہ انصاف ہے؟ یا ظلم و دہشت گردی، کیا اب
امن و اہنسا کے پیغام بر کی سرزمین میں جنگل کا قانون اور راون کا راج چلے گا؟ بات یہیں ختم نہیں
ہوتی، چند نام نہاد مسلمانوں کے رویے کی وجہ سے اسلام کو جو امن و صلح پسند مذہب ہے ظلم و تشدد،
دہشت گردی اور جارحیت کی تعلیم دینے والا قرار دیا جا رہا ہے اور یہ وہ لوگ کہہ رہے ہیں جن کا نام

ہی کمزوروں اور مظلوموں کے استحصال کی علامت بن گیا ہے اور جو اپنی دہشت گردی اور ایٹمی ہتھیاروں کی فوقیت سے خلق خدا کو عاجز اور امن عالم کو درہم برہم کئے ہوئے ہیں، آخر پریس اور ذرائع ابلاغ پر سے ان کا تصرف کب ختم ہوگا اور طاقت و اقتدار سے وہ کب محروم ہوں گے، سرمایہ پرستی کا یہ سفینہ کب ڈوبے گا۔

اسلام اور مسلمانوں کو دہشت پسند قرار دینے کی یہ منظم سازش اس ''نئے سیاسی کلچر'' کو ملک میں برپا کرنے کا ایک جز ہے، اس کی کوشش آزادی اور ملک کی تقسیم کے بعد ہی شروع ہوگئی تھی، کیوں کہ صدیوں میل جول سے بنے مشترکہ کلچر اور گنگا جمنی تہذیب کو ختم اور اقلیتوں کے خلاف نفرت، اشتعال اور تشدد بھڑکائے بغیر یہ سیاسی کلچر نشو و نما نہیں پاسکتا جس کی صورت ایک مشہور دانش ور جناب شکیل الرحمن کے بقول ''آج اتنی مکروہ اور بھیانک ہوگئی ہے کہ اسے دیکھ کر جمہوریت خوف زدہ ہورہی ہے، اس کی سیاہ پرچھائیں آئین ہند پر پڑنے لگی ہے، ملک اور اس کی تاریخ و تہذیب کی اعلا اور افضل قدریں چرمرانے لگی ہیں، ایک عجیب و غریب قومی کلچر کا تصور سامنے لایا جارہا ہے، جس کا تعلق تاریخی سچائی سے نہیں ہے، اس تصور نے بڑا نقصان پہنچانا شروع کردیا ہے'' اس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ ملک کے سیوکلر اور سنجیدہ لوگ آگے بڑھ کر ان عناصر کی بیخ کنی کریں جو فتنہ و فساد برپا کر کے ملک کے سیاسی و معاشرتی حالات کو درہم برہم اور عدلیہ کی توہین کر کے حکومت اور ملک کے آئین، جمہوریت اور سیوکلرازم کی کوئی پروا نہیں کررہے ہیں۔

مشہور و ممتاز ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ کا انتقال ۹۰ برس کی عمر میں ۲۳؍جنوری ۲۰۰۲ء کو دہلی میں ہوا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں تدفین ہوئی، جامعہ سے عمر بھر ان کا گہرا تعلق رہا، وہ اس کے شعبہ تعلیم (استادوں کے مدرسہ) کے معماروں اور قومی سطح کے ماہرین تعلیم میں تھے۔ رسالہ جامعہ کے شعبہ ادارت سے منسلک تھے اور اس میں ان کے مضامین بھی چھپتے تھے، انہوں نے اردو اور انگریزی میں متعدد کتابیں لکھیں جن میں تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر، تعلیم، فلسفہ تعلیم اور سماج، بنیادی استاد کے لئے، ہم کیسے پڑھائیں، Education of Muslims in thought Secular India can Education do it Education اور or Basic وغیرہ قابل ذکر ہیں، وہ عمر بھر علمی و تعلیمی خدمت میں مصروف رہے، ان کی وفات علمی و تعلیمی دنیا کا بڑا حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین!!۔

مقالات

''حجۃ اللہ البالغہ'' کا سنہ تصنیف

از

پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی *

فکر ولی اللّٰہی کے مطالعہ و تحقیق کا ایک خلاصہ یہ ہے کہ اس کی سب سے عظیم و جدید تالیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا سنۂ تالیف قطعی اور متعین طور سے نہیں معلوم ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی (۴؍شوال ۱۱۱۴ھ/۲۱ فروری ۱۷۰۳ء۔ ۲۹/محرم ۱۱۷۶ھ/۲۰؍اگست ۱۷۶۲ء) کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تاریخ تالیف نہیں مل سکی، ''حجۃ'' کے جتنے مطبوعہ نسخے ملتے ہیں ان میں اس کی تالیف کے زمانے کا کوئی اشارہ نہیں ملتا، غالباً تمام کی تمام مطبوعہ اشاعتیں اس مخطوطہ پر مبنی ہیں جس میں ترقیمہ نہیں ہے یا اس میں تاریخ تالیف مذکور نہیں ہے۔

اس باب خاص میں ایک اور تحقیقی خلا یہ پایا جاتا ہے کہ ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا متن متعدد مخطوطات کے تقابلی مطالعہ پر مبنی نہیں ہے، جن اہل علم نے ''حجۃ'' کے

* صدر شعبہ، ڈائرکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی، ریسرچ سیل، ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ۔

متن پر کام کیا ہے یا اسے چھاپا ہے انہوں نے ایک دو خطی نسخوں پر ہی اکتفا کرنا مناسب سمجھا اور تدوین متن کے سلسلے میں اس کے مختلف اختلافات کی نشاندہی نہیں کی ان کے ماخذ مخطوطات میں ترقیمے نہیں تھے اور اگر تھے تو ان میں زمانۂ تالیف کا کوئی حوالہ نہ تھا، اس کا امکان بہرحال ہے کہ اگر ''حجۃ'' کے متعدد، تمام نہ سہی، مخطوطات کا باریک بینی سے مطالعہ اور اس کے متن کے اختلافات کی گہرائی سے چھان بین کی جاتی تو شاید کسی میں سنۂ تالیف کا سراغ مل جاتا۔

آج سے سال ڈیڑھ سال قبل جب فکر ولی اللّٰہی پر تحقیقی کام کی سعادت اس خاکسار راقم کو ارزانی ہوئی تو ''حجۃ'' کے باب میں اس کا تاثر تھا: ''یہ حیرت سے زیادہ افسوس و شرم ساری کی بات ہے کہ ان کی کتابوں اور رسالوں میں چند کے سوا کسی کی توقیت نہ ہو سکی، مثال کے طور پر ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا ابھی تک حتمی طور سے سنہ تصنیف بھی متعین نہیں کیا جا سکا، اگرچہ جے، ایم، ایس، بلجان، اطہر عباس رضوی اور غلام مصطفے قاسمی نے ان کے زمانہ تصنیف کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے، مگر وہ زیادہ تر قیاسی بنیادوں پر استوار ہے۔'' (شاہ ولی اللہ'' کا فلسفہ سیرت، علی گڈھ، ۲۰۰۱، عرض اولیں ۱۳) اپنی اسی پہلی تالیف میں (۱۶) وعدہ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال رہی تو ''حجۃ اللہ البالغہ'' جیسے عظیم دائرہ معارف اسلامیہ کا زمانہ تالیف متعین کرنے کی کوشش کروں گا، موجودہ مختصر مقالہ اسی سمت میں پہلا قدم ہے، کیوں کہ ابھی راہ کی تمام مشکلات و موانع دور نہیں ہو سکیں۔

سردست ہمارے پاس ''حجۃ'' کی تاریخ تالیف سے متعلق دو قطعی مختلف بلکہ متضاد آرا میں موجود ہیں، ایک کاوش جی این، جلبانی کی ہے جس کے مطابق شاہ ولی اللہ کی

یہ شاہکار تالیف ان کے آخری عرصہ حیات کی ہے'' انہوں نے قطعی طور سے یہ بات لکھی ہے کہ شاہ صاحب کا یہ عظیم کارنامہ ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء کے بعد ہی وجود میں آیا تھا، یعنی شاہ صاحب کی وفات سے چھ سات سال پہلے، ان کی توقیت چند قرائن و قیاسات پر مبنی ہے، اولین قرینہ یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے قیام مکہ مکرمہ، کے دوران ایک رات اشارۂ غیبی میں ہدایت پائی کہ وہ اسلام کو اس کے صحیح پس منظر میں پیش کریں، وطن واپس آنے کے بعد شاہ صاحب اس غیبی فیض کو عملی جامہ پہنانے میں تذبذب کا شکار رہے، کیوں کہ حالات اس کے حق میں استوار نہ تھے، لیکن اس غیبی فیض کو بہرحال اثر انداز ہونا تھا، چنانچہ ان کے سب سے عزیز شاگرد محمد عاشق (پھلتی ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳) نے اس عظیم کام کو انجام دے ڈالنے پر اتنا اصرار کیا کہ شاہ صاحب کا تذبذب دور ہو گیا اور انہوں نے اس عظیم کام کا بیڑا اٹھا ہی لیا، اس کام کی شروعات کی قطعی تاریخ متعین کرنی مشکل ہے، لیکن چونکہ کتاب خاصی ضخیم ہے اور بہت ہی معنی آفرین، لہٰذا اس نے تکمیل کے لئے کافی وقت لیا ہوگا، اس کی تکمیل کی ممکنہ تاریخ یا سنہ ۱۱۸۳/۱۷۶۹ کے بعد ہی کا ہے۔

اس کے اسباب بہت ہی واضح ہیں، شاہ صاحب ''حجۃ'' میں بیان کرتے ہیں کہ ایک سہ پہر انہوں نے دیکھا کہ موت ان کے بیمار بچوں میں سے ایک پر اتر رہی ہے اور وہ سچ مچ اسی رات مر گیا، جلبانی نے ''حجۃ'' اول ۶۶، کے حوالے سے حاشیہ میں شاہ صاحب کی یہ عبارت بھی نقل کی ہے: ''........ **ومنها ان بعض اولادی کان مریضا...... فبینما انا اصلی الظهر شاهدت موته نزل فمات فی لیلته**'' اس کی بنا پر جلبانی نے یہ استنباط کیا ہے کہ لفظ ''اولاد'' جمع کا صیغہ ہے، اور اس بنا پر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس وقت شاہ صاحب کی کم از کم تین

اولادیں ہونی چاہئیں، جس مرنے والے فرزند ربچہ کا حوالہ ہے وہ شاہ صاحب کے فرزند محمد تھے، جو پہلی بیوی کے بطن سے تھے اور پھر ان کے دوسرے دو اولین فرزند شاہ عبد العزیز اور شاہ رفیع الدین تھے، جو دوسری بیوی کے بطن سے بالترتیب ۱۱۵۹/۱۷۴۶ اور ۱۱۶۳/۱۷۵۰ میں پیدا ہوئے تھے، لہٰذا ان کا یہ شاہ کار یقینی طور سے اس تاریخ کے بعد ہی تکمیل کو پہنچا ہوگا'' (لائف آف شاہ ولی اللہ (انگریزی) نئی دہلی ۱۹۸۰، ۳۸۔۳۷)

جلبانی کی اس توقیت میں کئی نقص ہیں: اول یہ کہ انہوں نے ''حجۃ'' کا امکانی ہجری سنہ تالیف ۱۱۸۳ھ دیا ہے، جو قطعی غلط ہے، شاہ صاحب اس سے سات سال قبل وفات پا چکے تھے، یہ عین ممکن ہے کہ یہ سنہ ہجری کتابت کی غلطی ہو مگر ۱۷۶۹ بظاہر کتابت کی غلطی نہیں معلوم ہوتا، جس کے مطابق سنہ ہجری ۱۱۸۳ تھا یہ تاریخ بھی مولف ''حجۃ'' کی وفات کے بعد کی ہے۔ دوسرے یہ کہ تیسرے فرزندِ شاہ۔ شاہ رفیع الدین۔ کی پیدائش کے چھ سال بعد ''حجۃ'' کی تکمیل کی تاریخ متعین کی گئی ہے جو کافی موخر ہے، تیسری بوالعجبی یہ ہے کہ ''شاہ ولی اللہ کی پہلی شادی ان کے ننھیالی خاندان (صدیقی) میں اپنے ماموں شاہ عبید اللہ کی صاحب زادی امۃ الرحیم سے موضع پھلت ضلع مظفر نگر میں ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶۔۰۷ میں ہوئی، ان کے بطن سے شاہ صاحب کے بڑے بیٹے شیخ محمد محدث پیدا ہوئے۔۔۔ شیخ محمد نے قصبہ بڈہانہ (ضلع مظفر نگر) میں ۱۲۰۸ھ/۹۴۔۱۷۹۳ء میں انتقال کیا۔۔۔ ''**دخل فی الجنۃ**'' سے تاریخ وفات ملتی ہے''۔ (نثار احمد فاروقی، مقدمہ نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، تحقیق و ترجمہ نسیم احمد فریدی پھلت ۱۹۹۸ء، ۵۷)

جلبانی نے جس فرزند شاہ کو ان کی زندگی ہی میں مردہ قرار دیا ہے ان کی وفات شاہ صاحب کے بتیس سال بعد ہوئی تھی۔ مزید یہ کہ ''بعض اولادی'' سے تین

اولادوں کا مراد لینا بھی تحقیقی ستم ظریفی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے جلبانی کی توقیت ''حجۃ'' بداہۃً غلط ہے۔

اس کے برعکس اطہر عباس رضوی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی کا یہ شاہکار ۱۱۴۵/۱۷۳۲ اور ۱۱۵۱/۱۷۳۹ کے درمیان کسی وقت مرتب و مکمل ہوا تھا۔ انہوں نے اس کے دلائل تو نہیں دیئے لیکن ترتیب کے اشارات کئے ہیں، (شاہ ولی اللہ اینڈ ہز ٹائمس (انگریزی) کینبرا ۱۹۸۰ء، ۲۱۔۲۲۰) خاکسار راقم نے بھی ان کی توقیت اپنی کتابوں میں تسلیم کر لی تھی کہ خود اس کی اپنی کوئی تحقیق اس وقت تک نہ تھی (شاہ ولی اللہ کا فلسفہ سیرت، ۲۷، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ شخصیت و حکمت کا ایک تعارف۔ علی گڈھ، ۲۰۰۱، ۱۶)

مارسیا کے ہرمینسن (Marcia K.Hermansen) نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی قسم اول کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، جو ''The conclusive Argument from God'' عنوان سے لائیڈن سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا ہے، انہوں نے اس میں ''حجۃ'' اور بعض دوسری تصانیف شاہ کی توقیت کے سلسلے میں غلام مصطفے قاسمی (**التفہیمات الالٰہیہ** مقدمہ عربی، غلام مصطفے قاسمی، شاہ ولی اللہ دہلوی اکاڈمی، حیدر آباد، سندھ ۱۹۷۳ء، اول ۳۷۔۱۵) کی تحقیقات کا حوالہ دیا ہے مگر خود کوئی محاکمہ نہیں کیا، (۴۸۹ و مابعد) ان محققین کی کاوشیں فی الحال ہمیں دستیاب نہیں لہٰذا ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی تاریخ تصنیف سے متعلق ان سے بحث ممکن نہیں۔

ابھی تک فکر ولی اللہی کے ماہرین نے نہ تو شاہ صاحب کی کوئی تحریر اس باب میں پائی ہے اور نہ ان کے معاصرین یا نیم معاصر تلامذہ اور خلفاء کی۔ اس لئے یہ بات

بہت حیرت انگیز ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے قابل فخر سرمایۂ حیات کی تاریخ تصنیف نہیں دی، یہ بات اور حیرت ناک بن جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے اپنے بعض دوسرے وقیع یا غیر وقیع کارناموں اور مختصر رسالوں کی تاریخ تصنیف دی ہے۔

مثال کے طور پر شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے فارسی ترجمہ قرآن کریم ''فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن'' کی تکمیل کی تاریخ عیدالاضحی یعنی ۱۰/ ذوالحجہ ۱۱۵۰ھ/۳۱/ مارچ ۱۷۳۸ء دی ہے۔ (مقدمہ فتح الرحمٰن، تاج کمپنی لاہور، ۱۹۸۶ء، ب) بلکہ صحیح کہنا یہ ہوگا کہ شاہ صاحب نے ترجمۂ قرآن کی تسوید، تبییض اور تکمیل کی تین تین تاریخیں دی ہیں اور اس کے آغاز، توقف اور سلسلۂ کا زمانہ بھی بیان کیا ہے، شاہ صاحب کے دو نعتیہ قصائد۔ بائیہ و ہمزیہ۔ کے مجموعہ ''**اطیب النغم فی مدح سید العرب و العجم**'' کی فارسی شرح کی تالیف کی تکمیل کی، تاریخ ۲۴/ ربیع الثانی ۱۱۵۶ھ انہوں نے بیان کی ہے جو ۱۷/ جون ۱۷۴۳ء کے مطابق ہے، یہ قصیدہ بائیہ کی فارسی شرح کی تکمیل کی تاریخ ہے جب کہ مرتب و مترجم پیر محمد کرم شاہ ازہری نے قصیدہ ہمزیہ کی فارسی شرح کی تاریخ ۱۱/ جمادی الاولی ۱۱۷۷ھ دی ہے، یہی تاریخ شاہ صاحب کے فارسی عربی ترقیمہ میں ہے اور مترجم کے اردو ترجمہ میں بھی (''این است آن چہ در ترجمہ قصیدہ ہمزیہ مفتوح شد۔ **کان ذلک یوم الخمیس احدی عشر من شهر جمادی الاولی** ۱۱۷۷ھ.....'') یہ سن ہجری یقینی طور سے شاہ صاحب کا تحریر کردہ نہیں ہے کہ اس سے لگ بھگ ڈیڑھ سال قبل ۲۹/ محرم ۱۱۷۶ھ کو (حتمی طور سے ۱۶ ماہ دس دن قبل) شاہ صاحب کی وفات ہو چکی تھی۔ مترجم مذکور و موصوف نے شاہ صاحب کے

قصیدہ بائیہ کی تاریخ میں بھی ایک جگہ ۱۱۵۶ھ کی جگہ ۱۱۶۵ھ لکھ دیا ہے، وہ کاتب کی غلطی بھی ہو سکتی ہے، (**اطیب النغم**، لاہور ۱۹۸۵ء، ۶۸_۱۶۷ اور ۲۲_۲۲۱ بالترتیب)

شاہ ولی اللہ کے اپنے قلم حقیقت رقم سے جن تصانیف کی تاریخ لکھی گئی ہے ان میں سے ایک ''**ہمعات**'' نامی مختصر رسالہ ہے، جو تصوف کے آغاز، ارتقاء، تاریخ اور مختلف سلاسل کے مقاصد و مباحث کے علاوہ بعض ''احسانی مباحث'' سے تعرض کرتا ہے، اس کے ترقیمہ کی عبارت ہے: ''**الحمد للہ والمنۃ** کہ کتاب ہمعات باختتام رسید....
وکان ذلک فی جمادی الآخرۃ سنۃ ثمان و اربعین و مائۃ و الف۔۔
(اکادمیۃ الشاہ ولی اللہ الدہلوی، حیدرآباد، سندھ، ۱۹۴۱ء، ۱۳۵) جس کا اردو ترجمہ محمد سرور جامعی نے یوں کیا ہے: ''ہمعات'' ۱۱۴۸ھ جمادی الآخر میں اختتام کو پہنچی (اردو ترجمہ بعنوان ''تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفۂ تاریخ'' لاہور ۱۹۹۹ء، ۲۱۲) خاکسار راقم نے اس سنہ ہجری کی سنہ عیسوی کی مطابقت میں لکھا ہے: ''مؤلفہ در جمادی الثانیہ ۱۱۴۸ھ/ اکتوبر۔ نومبر ۱۷۳۵ء'' (.....شخصیت و حکمت کا ایک تعارف، علی گڈھ ۲۰۰۱ء، ۱۶)

''ہمعات'' میں حضرت مؤلف نے ایک ایسا اشارہ کیا ہے جو ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے زمانہ تصنیف کے دورانیہ کو خاصہ محدود کر دیتا ہے، اور کم از کم اس کی تکمیل کا تقریباً حتمی ثبوت فراہم کرتا ہے، اس مختصر رسالہ کی ایک اہم بحث کا عنوان ہے: ''انسانیت کے چار بنیادی اخلاق'' ان کے سلسلہ میں شاہ صاحب رقمطراز ہیں کہ ''تہذیب نفس کے سلسلے میں شریعت کا مقصود دراصل یہ ہے کہ انسانوں میں یہ چار خصلتیں پیدا ہوں، اور جو چیزیں ان چار خصلتوں کے خلاف اور ان کی ضد ہیں ان کی نفی کی جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو انہی چار خصلتوں کو بروئے کار لانے کے لئے مبعوث فرمایا اور تمام شرائع الٰہی کا یہی مقصد ہے کہ وہ ان چار خصلتوں کی تلقین کریں.....'' (اردو

ترجمہ، ۱۵۰) اس کے بعد شاہ صاحب نے ایک ایک کرکے ان چار خصلتوں کی تشریح کی ہے اور وہ چار خصلتیں ہیں: "۱۔ طہارت، ۲۔ اللہ کی جناب میں عجز و خضوع اور اس کی طرف اپنی چشم و دل کو یکسر متوجہ کردینا، ۳۔ سماحت اور ۴۔ عدالت" (۵۸۔۱۵۱)

اس کے بعد شاہ صاحب نے جو مختصر سا اشارہ کیا ہے وہ ایک بڑی علمی گتھی کو بخوبی سلجھاتا ہے۔ فرماتے ہیں "الغرض ان امور کا مفصل بیان بڑی طوالت چاہتا ہے جس شخص کو تفصیلات کا شوق ہو وہ ہماری کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" کی طرف رجوع کرے، یہاں تو ہمارا مقصد صرف ان چار خصلتوں کا تعارف کرانا ہے..." (ہمعات ۱۵۸)

فارسی متن کی عبارت ہے: "وبالجملہ ایں سخن دراز است۔ ہر کہ ایں رابہ تفصیل خواہد باید کہ بہ کتاب ما "حجۃ اللہ البالغہ" رجوع کند۔ مقصود ما این جابیان نفس این خصال است باید کہ سالک طریق ایں چہار خصلت راشناسد....." ("ہمعات" مرتبہ نور الحق العلوی، غلام مصطفی قاسمی اکادیمیۃ الشاہ ولی اللہ الدہلوی، حیدرآباد، سندھ ۱۹۴۱ء، ۹۶)

شاہ صاحب کے اس قطعی بیان سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ "حجۃ اللہ البالغہ" کی تالیف و تکمیل بہرحال "ہمعات" کی تصنیف سے قبل ہوچکی تھی، یعنی جمادی الثانیہ ۱۱۴۸ھ/ اکتوبر۔ نومبر ۱۷۳۵ء سے کافی پہلے۔ کافی پہلے اس لئے کہ شاہکار شاہ "حجۃ اللہ البالغہ" اگر مکمل و مرتب ہوکر علمی حلقوں میں متداول و مقبول نہ ہوچکی ہوتی تو مؤلف گرامی "ہمعات" میں اس کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ اپنے قارئین ہمعات کو نہ دیتے، اطہر عباس رضوی اور ان کے ہم نوا دوسرے محققین کا یہ موقف کہ "حجۃ اللہ البالغہ" ۱۱۴۵/ ۱۷۳۲ کے بعد مرتب ہوئی تھی، بالکل صحیح ثابت ہوتا ہے۔ البتہ انہوں نے ۱۱۵۱/ ۱۷۳۹ کی جو آخری حد زمانی مقرر کی تھی وہ اب قطعی طور سے سمٹ کر ۱۱۴۸/ ۱۷۳۵ تک محدود ہوجاتی ہے۔

اس قطعی ثبوت اور متعدد دوسرے شواہد و قرائن سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حرمین شریفین سے اپنی واپسی کے کچھ دنوں بعد اپنی شاہکار تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" کو لکھنا شروع کیا اور تسوید و تبییض اور ترتیب و تکمیل کے مختلف مرحلوں کے بعد اسے "ہمعات" کی تالیف سے قبل ۱۱۴۸/ ۱۷۳۵ میں مکمل کرلیا تھا، شاہ صاحب نے حرمین شریفین کا سفر ۱۱۴۳/ ۱۷۳۰ کے وسط میں اختیار کیا، وہ بقول شاہ عبدالعزیز وہاں چودہ ماہ اقامت پذیر رہے اور حدیث کی تعلیم حاصل کرتے رہے، آمدورفت کے سفر میں تقریباً ایک سال سے زیادہ کی مدت لگی، اور بقول خود ۱۴/ رجب ۱۱۴۵ کو بروز جمعہ وطن مالوف واپس پہنچے (برکاتی ۱۲۔۱۱ نے بحوالہ سید ظہیر الدین احمد (تاویل الاحادیث ۸۷) لکھا ہے کہ "شاہ صاحب ۸ ربیع الثانی ۱۱۴۳ھ کو روانہ ہوئے تھے اور ۹/ رجب ۱۱۴۵ھ کو واپس ہوئے"۔ "..... سات سات ماہ آمدورفت میں گذرے" انفاس العارفین، اردو ترجمہ محمد فاروق قادری، لاہور، ۱۹۹۸ء، ۴۰۶ میں خود شاہ صاحب نے صراحت کی ہے کہ وہ ۱۴/ رجب کو وطن پہنچے تھے)

وطن واپسی کے بعد کچھ دن ان کو سوا دو سالہ پر مشقت سفر کی تھکن اتارنے میں لگے ہوں گے اور اپنے مبارک سفر کے فیوض و برکات اور حادثات و واقعات بیان کرنے میں یہ عرصہ گذرا ہوگا، اس دوران بعض مختصر رسائل کی تالیف کا بھی ڈول ڈالا ہوگا کہ ان میں زیادہ مدت درکار نہیں تھی، پھر اس ہچکچاہٹ اور تذبذب پر قابو پانے میں کچھ وقت لگا ہوگا جس کا اوپر حوالہ آچکا ہے کہ شاہ صاحب نے خانۂ کعبہ کی مجاورت میں اسلام کو اس کے صحیح علمی اور فکری تناظر میں پیش کرنے کے سلسلے میں ایک اشارۂ غیبی اور مشاہدۂ ربانی وصول کیا تھا، مگر مختلف اسباب و وجوہ سے اس کو بروئے کار لانے میں تامل اور پس و پیش کا شکار تھے، قرائن و شواہد یہ بتاتے ہیں کہ شاہ صاحب نے

۱۷۳۲/۱۱۴۵ کے اواخر میں یا زیادہ سے زیادہ ۱۱۴۶/۱۷۳۳ کے اوائل میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی تالیف شروع کردی تھی، اور ڈھائی تین سال کی محنت شاقہ کے بعد ۱۱۴۸/۱۷۳۵ کے وسط تک اسے مکمل ہی نہیں مقبول عوام وخواص بنادیا تھا۔

شاہ صاحب کے سفر حرمین کے معاً بعد بلکہ دو تین سال کے اندر ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی تالیف کئے جانے کے بعض اور قرائن اور شواہد ملتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ مقدس ومبارک مقامات ۔ مکہ ومدینہ ۔ میں شاہ صاحب کو حدیث نبوی سے اتنا شغف ہوگیا تھا کہ دوسرے علوم وفنون اگر یکسر فراموش نہیں ہوگئے تھے تو فوری توجہ کے طالب نہیں رہے تھے، شاہ صاحب کا اپنی خودنوشت میں بھی اور اپنے استاذ حدیث شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی (م ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء) کے خاکہ میں اس کا اقرار واعتراف ملتا ہے، اور ان کے فرزند ارجمند شاہ عبدالعزیز کے بیان میں بھی۔

اپنے استاذ حدیث کی نسبت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''ایں فقیر برائے وداع نزدیک شیخ ابوطاہر رفت ایں بیت برخواند

نسیت کل طریق کنت اعرفه الا طریقا یو دینی لربعکم

بمجرد شنیدن آں بکا بر شیخ غالب آمد وبغایت مشتاقانہ شد...'' (انسان العین/ انفاس العارفین (فارسی) ۱۹۲ بحوالہ برکاتی ۱۱، جنہوں نے عربی شعر کا دوسرا مصرعہ صحیح نقل نہیں کیا کہ اس میں ''الا اربعکم'' ہے) یعنی جس روز میں (شاہ ولی اللہ) وطن واپس ہوتے وقت شیخ ابوطاہر کی خدمت میں الوداعی سلام کے لئے حاضر ہوا تو بے اختیار میری زبان پر یہ شعر آگیا۔.... (میں تیرے گھر کی طرف جانے والے راستہ کے علاوہ باقی سارے راستے بھول گیا) یہ شعر سنتے ہی حضرت شیخ پر گریہ طاری ہوگیا

اور بہت متاثر ہوئے.....'' (انفاس العارفین اردو، ۲۰۰)

فرزند شاہ شیخ عبدالعزیز دہلوی نے فرمودۂ والد ماجد کی یہ تعبیر وتشریح کی ہے:

''پدر من وقت رخصت از مدینہ استاد خود عرض کرد او خوش شد، کہ ہر چہ خواندہ بودم فراموش کردم الا علم دیں یعنی حدیث ۹۳ (میرے والد نے مدینہ منورہ سے رخصت کے وقت اپنے استاد سے عرض کیا جس سے وہ خوش ہوئے کہ میں نے علم دین یعنی حدیث کے علاوہ جو کچھ پڑھا تھا اسے بھلادیا) (برکاتی ۱۱)

ملفوظات عزیزی، حیات ولی القول الجلی اور بعض دوسرے معاصر ونیم معاصر اور متاخر مآخذ کے متعدد بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی سفر حرمین کے بعد صرف منتہی طلبا کو تعلیم وتربیت دیتے تھے اور باقی وقت تالیف وتصنیف پر صرف فرماتے تھے، تعلیم حدیث شریف کی اعلی کتابوں کی اور تربیت وتزکیہ مختلف سلاسل وطرق تصوف میں اسی طرح تالیف وتصنیف میں زیادہ زور حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر رہا، بالخصوص اولین عہد میں۔ ملفوظات عزیزی میں ہے ''حضرت والد ماجد از ہر یک فن شخصے تیار کردہ بودند، طالب فن بادے می سپردند وخود مشغول معارف گوئی ونویسی می بودند وحدیث می خوانیدند بعد مراقبہ ہر چہ بکشف می رسید می نگاشتند... (حضرت والد ماجد نے ہر ایک فن کے لئے ایک شخص کو تیار کردیا تھا اور ہر فن کے طالب علم کو اس کے (فاضل کے) سپرد کردیتے تھے اور حقایق ومعارف بیان اور تحریر کرنے میں مشغول رہتے تھے، مراقبہ کے بعد جو کچھ کشف ہوتا اس کو لکھ لیتے تھے..... برکاتی ۱۲۔)

اس کی واقعاتی شہادتوں سے بھی تصدیق ہوتی ہے، مکہ ومدینہ سے واپسی کے معاً بعد شاہ صاحب نے ایک دو رسالوں کے سوا تمام رسائل وکتب حدیث نبوی سے متعلق لکھیں، ان میں: ۱۔ الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین

(عربی) ۲۔ النوادر من احادیث سید الاوائل والاواخر (عربی) ۳۔ المسلسلات من حدیث النبی (عربی) ۴۔ اربعون حدیثا..... (عربی) ۵۔ الارشاد الی مہمات علم الاسناد (عربی) ۶۔ شرح تراجم ابواب صحیح البخاری (عربی) (۷) فیوض الحرمین (عربی) اور (۸) حجۃ اللہ البالغہ (عربی) شامل اور ممتاز ہیں۔ ان سب کا تعلق حدیث نبوی سے ہی ہے، فیوض الحرمین کے باب میں شاید یہ کہا جائے کہ اس کا تعلق مبشرات و اکتشافات سے ہے جو شاہ صاحب کو روضہ نبوی پر مراقبہ کے دوران دربارہ رسول اکرم ﷺ سے عطا ہوئے تھے، اس بنا پر وہ بھی حدیث کے ضمن میں آتے ہیں اور اس کو استثنا سمجھا جاسکتا ہے، اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ شاہ صاحب نے یہ تمام تالیفات عربی زبان میں لکھی تھیں، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حرمین سے واپسی کے بعد ان پر عربی زبان کا غلبہ شدید تھا، نیز ان کے مضمون حدیث نبوی کا تقاضا بھی اسی زبان نبوی کا تھا۔

"حجۃ اللہ البالغہ" بھی بنیادی طور سے حدیث کی کتاب ہے اگرچہ اس کو بالعموم "علم اسرار دین و شریعت" کا قاموس کہا اور سمجھا جانے لگا ہے۔ ماہرین فکر ولی اللٰہی نے اس کا موضوع فن حدیث ہی قرار دیا ہے، محمد متین ہاشمی رقمطراز ہیں: "علم حدیث کی خدمات جلیلہ کے سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کا یہ کارنامہ بھی کم اہم نہیں کہ آپ نے احادیث کی حکمتیں بھی بیان فرمادی ہیں، جو شخص "حجۃ اللہ البالغہ" کا مطالعہ کرے گا اسے حضرت شاہ صاحب کی اس خدمت کا اعتراف کرنا پڑے گا"..... (سطعات اردو ترجمہ، لاہور ۱۹۹۹ء مقدمہ ۱۸) نثار احمد فاروقی نے اسے فقہ الحدیث کی کتاب قرار دیا ہے (مقدمہ نادر مکتوبات، ۸۱) "حجۃ اللہ البالغہ" پر لکھنے والے بہت سے اہل علم کی شہادتیں نقل کی جاسکتی ہیں لیکن ان سے طول بیان کا خطرہ ہے۔

لیکن اصل بیان اور تشریح فن خود حضرت مولف کی تحریر میں ملتی ہے جو

ناقابل تردید حقیقت ہے اور وہی بعد کے اہل قلم کی آراء کی بنیاد بھی بنی ہے۔ شاہ صاحب "حجۃ اللہ البالغہ" کو "اسرار حدیث" کی کتاب سمجھا کرتے تھے، چنانچہ "السر المکتوم" میں ان کی ایک تحریر ہے: "**ومن اعظم منن اللہ تعالی علی هذا العبد ان وفقه لتخريج اسرار الحديث اجمالا و تفصيلا فدونها في كتاب سماه حجة الله البالغه** ......" (اس بندہ پر اللہ تعالیٰ کے عظیم ترین احسانات میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے بندہ کو اسرار حدیث کی اجمالی اور تفصیلی تخریج کی توفیق بخشی اور اس کو ایک کتاب میں مدون کردیا جس کا نام "حجۃ اللہ البالغہ" رکھا..... (جلبانی، ۳۹) خود "حجۃ اللہ البالغہ" کے مفصل و مدلل مقدمہ میں شاہ صاحب نے اسے "شرح اسرار الاحادیث" کی کتاب قرار دیا ہے، بالخصوص اس کی قسم دوم کو (مکتبہ سلفیہ لاہور غیر مورخہ ۱/۱۱) اس کی مزید تصدیق بلکہ زیادہ معتبر شہادت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ کی قسم اول کے خاتمہ پر فراہم کی ہے جہاں انہوں نے کتاب مستطاب کا عنوان کامل "حجۃ اللہ البالغہ فی علم اسرار الحدیث" لکھا ہے (۱/۱۶۲)۔

ان تمام داخلی و خارجی شواہد، علمی و تحقیقی قرائن اور شاہ صاحب کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی شاہکار تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" سفر حرمین کے مابعد کی کتاب ہے جس کی تالیف ۱۱۴۵/۱۷۳۲ء کے اواخر یا اگلے برس کے اوائل میں شروع ہوئی اور ۱۱۴۸/۱۷۳۵ کے وسط سے پہلے پہلے وہ مکمل و مرتب ہوکر متداول و مقبول عام و خاص ہوئی گویا کہ اس کی تالیف و تکمیل میں تین سال (۳۵-۱۷۳۲ء) کا عرصہ لگا۔ اس کا بہرحال امکان ہے کہ مطالعہ و تحقیق سے "حجۃ" کی تالیف کے زمانے کے باب میں مزید شواہد ملیں مگر ان سے غالباً کوئی جوہری فرق نہیں پڑے گا، چند مزید تفصیلات و جزئیات کا فرق پڑسکتا ہے۔

پروفیسر محمد الیاس برنی

از ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی ٭

(۳)

بعض فروگذاشتیں برنی صاحب اپنے زمانے کے عظیم شخص تھے، لیکن عظیم اشخاص بھی غلطیوں سے مبرا نہیں ہوتے۔ یہ لازمۂ بشریت ہے۔ برنی صاحب سے بھی بعض غلطیاں ہوئی ہیں مثلاً "تحفۂ محمدی" میں درود تاج باترجمہ شامل ہے۔ اس میں بعض الفاظ قابل اعتراض ہیں اور وہ صحیح احادیث سے ثابت نہیں ہیں اور یہ درود شریف کی معتبر کتابوں میں منقول نہیں ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ اپنا انتخابی درود اس میں شامل کرتے تو بہتر ہوتا۔ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنی چاہئے کہ اگر معمول بہا عبادات کے اجر و ثواب سے زیادہ کسی عمل کا اجر و ثواب بتایا جائے تو یہ بات اس کے جعلی اور بناوٹی ہونے کی نشانی ہے۔

نذر و نیاز کے مسئلے میں ان کی یہ رائے درست ہے "یوں تو ایصال ثواب کے لئے کوئی دن و تاریخ اور کوئی طور طریقہ معین نہیں" تاہم ہر کام کا ایک موقع اور سلیقہ ہوتا ہے۔ اگر اس کو لازم نہ سمجھا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ باقی نہیں رہتا۔

٭ شعبۂ تخصص علوم حدیث جامعۃ العلوم الاسلامیۃ، بنوری ٹاؤن، کراچی۔

لیکن علاوہ سب کچھ کرتے تھے جو عام طور پر رائج ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

"۱۲ محرم کو ہلیم (حلیم) پر سید الشہدا کی فاتحہ ہوئی غرض محرم شریف کی فاتحہ جو اپنا معمول ہے مدینہ منورہ میں بخیر و خوبی انجام پائی[1]"

ان کی مجموعی حسنات کے مقابلہ میں یہ فروگذاشتیں ایسی ہیں جن کا وزن زیادہ نہیں۔

ملازمت سے سبکدوشی برنی صاحب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں مختلف عہدوں پر فائز رہے دائرۃ المعارف کے ناظم بھی رہے اور آخر کے دو برسوں میں جامعہ عثمانیہ میں رجسٹرار ہوئے[2] اور اکتوبر ۱۹۴۸ء میں جامعہ عثمانیہ سے سبکدوش ہوئے[3] جس کے بعد ان کی زندگی کا تیسرا دور پورا ہوا۔ برنی صاحب کی زندگی کا زیادہ تر زمانہ حیدرآباد میں گزرا، وہیں کوٹھی بنوائی، حیدرآباد میں لڑکیوں کی شادیاں کیں، کتابیں لکھیں اور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۵۸ء تک تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا۔

وفات اگست ۱۹۵۷ء میں اپنی کوٹھی بیت السلام سیف آباد میں جو ایک خوشنما پہاڑی پر واقع ہے برنی نامہ لکھا، پھر دسمبر ۱۹۵۸ء کے آخر میں عزیزوں سے ملنے بلند شہر آئے۔ تقریباً ۸۹ سال کے تھے کہ ۲۵ جنوری ۱۹۵۹ء کو حرکت قلب بند ہوئی اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ قاضی کے قبرستان میں جہاں ان کے باپ دادا دفن ہیں، وہیں ان کی قبر ہے۔

تدفین کے وقت جب سینہ پر کافور ملا گیا تو وہ سمٹ کر لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کی صورت اختیار کر گیا تھا جسے دیکھ کر ناظرین حیران و ششدر رہ گئے۔ یہ ان بزرگوں میں سے تھے جن پر یہ فقرہ صادق آتا ہے:

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۱۵۰ و ۲۶-۲۰ [2] برنی نامہ ص ۲۲ [3] ایضاً۔

دنیا خورد و عقبیٰ برد — دنیا میں مزے اڑائے اور آخرت میں بھی کامیاب رہے

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ — یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے وہ جسے چاہے عطا فرمائے

یہ واقعہ مجھ سے ڈاکٹر فاروق مصطفیٰ صاحب نے بیان کیا کہ یہ میرے والد صاحب کا چشم دید واقعہ ہے۔

تلامذہ برنی صاحب نے عمر بھر پڑھایا، ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن تعلقات کم ہی شاگردوں سے رہے، جو شاگرد ان سے رہنمائی حاصل کرتے رہے یا جن کی تعلیم و تربیت کی سرپرستی و نگرانی ان کے سپرد رہی ان سے تعلقات قائم رہے۔ چنانچہ شہزادہ نواب اعظم جاہ بہادر ولی عہد کے دونوں شہزادے مکرم جاہ اور مفخم جاہ شاگرد رہے اور یہ ان کی تعلیم و تربیت میں شریک رہے وہ جب ولایت سے آتے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ملاقات کرتے تھے۔[1]

تصنیف و تالیف اور ترجمے برنی صاحب ایک اچھے مصنف و مترجم بھی تھے، کتابوں کا نام مختصر تعارف کے ساتھ آگے آئے گا۔ وہ تصنیف و ترجمے میں تین باتوں کی خاص طور پر پابندی کرتے تھے جس کی بنا پر ان کی کتابیں بہت مقبول ہوئیں۔

۱- سلاست زبان ۲- صفائی بیان ۳- دلچسپی مضامین[2]

یہ چیزیں واقعی بڑی اہم ہیں لیکن ان کے لئے صحت و استناد کو نہیں قربان کیا جا سکتا۔

شعر و سخن شناسی برنی صاحب کا ایک خاص وصف شعر فہمی اور سخن شناسی بھی ہے اردو شاعری کے انتخابات ان کی وسعت نظر اور سخن شناسی کا ثبوت ہیں۔ وہ خود بھی موزوں طبع تھے۔ اس کا اور منتخبات کا ذکر آگے تصانیف میں آئے گا۔

---

[1] برنی نامہ ص ۲۵ [2] علم المعیشت ص ۲۶۸۔

تصانیف و تراجم ذیل میں برنی صاحب کی تصانیف اور ترجموں کے نام مع تعارف پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کی تصانیف کے ایک سلسلے کا نام سلسلہ دعوت صدق تھا۔

۱- اسرار حق: آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور ارشادات صوفیہ کا ایک جامع و مربوط انتخاب ہے جن کے مقابل یورپ کے جدید سائنس اور فلسفہ کی انتہائی تحقیقات کا لب لباب دیا گیا ہے۔ اس سے اسلام کی حقانیت خود بخود ظاہر و نمایاں ہو جاتی ہے، اس کا پہلا ایڈیشن محمد مقتدیٰ خاں شروانی نے مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ سے ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء میں چار سو صفحات میں شائع کیا تھا۔

۲- تسہیل الترتیل: اس میں قرأت کی ضرورت و اہمیت، اس کے اصول و طریق، اس کے نکات و اشارات خاص ترتیب سے نہایت سہل اور عام فہم پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں، جن سے پڑھنے میں غلطی کا احتمال باقی نہیں رہتا، اصول قرأت سے واقف ہونے کے بعد تلاوت میں کچھ اور ہی لطف آتا ہے اور رمز حق کا راز کھلتا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۶۱ھ اور تیسرا ۱۳۶۲ھ میں شائع ہوا۔

۳- تحفۂ محمدی: یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے، ہر حصہ میں درود تاج با ترجمہ، ایک عربی سلام اور چالیس نعتیں شامل ہیں، گویا چار حصوں میں جملہ (۱۶۰) نعتیں درج ہیں، یہ نعتیں قدیم و جدید (۶۰) مشہور و مقبول شاعروں کے کلام سے انتخاب کی گئی ہیں۔ چوتھے حصے میں (۲۴) فارسی نعتیں بھی شامل ہیں۔ تاج کمپنی کراچی نے اس کو بذریعہ بلاک طبع کر کے دیدہ زیب شائع کیا ہے۔

۴- مشکوٰۃ الصلوات: صلوٰۃ و سلام، اسلامی معارف اور عربی ادب کا بہترین سرمایہ ہے گویا "وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ" کی الہامی تفسیر ہے۔ ان کے مطالعہ سے دل اثر

صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی عظمت و محبت دل میں پیدا ہوتی ہے۔ ان کے ورد سے نسبت محمدی کا فیضان ہوتا ہے اور دین کی نعمتوں کا دروازہ کھلتا ہے، غالباً اب تک صلوٰۃ وسلام کا کوئی ایسا مختصر و جامع ذخیرہ شائع نہیں ہوا، اس کا تیسرا ایڈیشن تاج کمپنی لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا جو اب نایاب ہے۔ مصنف کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کے دو سو نسخے مدینہ منورہ میں اور تین سو مکہ معظمہ میں تقسیم کئے تھے۔[1]

۵۔ **معروضہ**: یہ برنی صاحب کا شعری مجموعہ ہے، وہ الہ آباد یونیورسٹی میں امتحان لینے جاتے تو میر اکبر حسین صاحب الہ آبادی سے ملاقات کے لئے بھی جاتے، اپنا یہ مجموعہ کلام ان ہی کے اصرار سے شائع کیا تھا جو ہاتھوں ہاتھ نکل گیا تھا[2] اس میں حمد، نعت، منقبت و معرفت کی نظمیں سو سے زیادہ شامل ہیں۔ تاج کمپنی کراچی نے اس کا نفیس ایڈیشن آرٹ پیپر پر بذریعہ بلاک دیدہ زیب طبع کرکے مجلد شائع کیا ہے، جو کافی مقبول ہوا ہے۔ پھر ۴۳ مزید نظمیں ضمیمہ اول کے طور پر شامل ہیں۔

۶۔ **قادیانی مذہب**: باراول ۱۹۵۲ء۔ باردوم شمس الاسلام پریس حیدرآباد دکن ۱۳۵۲ھ میں صفحات ۲۴۴ پر شائع کی گئی تھی۔ اس میں قادیانیوں کے عقائد و اعمال کی تفصیل خود قادیانی کتابوں سے پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب قادیانی تحریک کی قاموس مانی جاتی ہے۔ چنانچہ پانچواں ایڈیشن (حجم بارہ سو صفحات تقطیع کلاں) مدت سے نایاب ہے چھٹا ایڈیشن اضافہ مضامین کے ساتھ شائع ہوا۔ محمد اشرف نے لاہور سے شائع کیا تھا۔

۷۔ **قادیانی قول و فعل**: حصہ اول پہلا ایڈیشن نایاب ہے اور حصہ دوم ۱۹۵۸ء

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۳۲؛ وص ۱۰۳ [2] برنی نامہ ص ۲۲۔

میں شائع کیا گیا تھا۔

۸۔ **صراط الحمید**: جلد اول، عراق، شام، فلسطین و حجاز کے مقدس مقامات کے گوناگوں چشم دید حالات، نہایت دلچسپ و مفید معلومات اور سیر و سفر کی اس میں تفصیلی داستان مذکور ہے، مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے مشاہدات، ایمانی احساسات بارگاہ اقدس کے انوار و برکات، فیوض و انعامات اور فریضہ حج کے احکام و مسائل طور و طریق اور ادعیہ و صلوٰت کا بیان ہے۔

اس سفرنامہ میں جابجا قرآنی معارف، ایمانی نکات، وہبی واردات، روابط قلبی کے نازک اشارات وغیرہ جن سے ایمان تازہ ہوتا ہے، دل کو عقیدت و محبت کا مزہ ملتا ہے عبارت کی لطافت اور معاصرین کے متعلق نادر معلومات اس پر مستزاد ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ سفرنامہ برنی صاحب کی دلچسپ آپ بیتی ہے اس کا احساس خود ان کو بھی تھا چنانچہ ج ۱ ص ۳۰۳ میں رقم طراز ہیں:

* بلا کم و کاست آپ بیتی لکھ دی اور آپ بیتی نہ لکھتا تو پھر کیا لکھتا، لکھنا لاحاصل تھا کچھ بھی نہ لکھتا، یہ توقع نہیں اور ممکن بھی نہیں کہ سب ناظرین ہم خیال ہوں ہم مذاق ہوں، ہم مشرب ہوں، ہم عقیدہ ہوں، تھوڑا بہت فرق رہنا ضرور ہے تاہم خدا کے فضل سے امید ہے کہ اپنی سرگزشت افراط و تفریط سے محفوظ ہے، رہی کوئی لغزش تو میں سراپا تقصیر ہوں، معصوم نہیں ہوں، انابت و مغفرت ہی کا اپنا سہارا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔

صراط الحمید کا پہلا ایڈیشن ۱۳۴۶ھ میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۳۵۰ھ میں مطبع برقی اعظم جاہی حیدرآباد دکن سے شائع کیا گیا تھا۔

۹- صراط الحمید جلد دوم : برنی صاحب نے اس کا تعارف یوں کرایا ہے:

"۱۳۵۱ھ میں دوسری مرتبہ حج و زیارت کی سعادت حاصل ہوئی، حرمین شریفین میں حاضری نصیب ہوئی تو دوسرا سفرنامہ تحریر میں آیا جو صراط الحمید جلد دوم میں شائع ہوا۔

یہ سفرنامہ پہلے سفرنامے سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، عنوانات جدا، بیانات جدا۔ اس میں مکہ معظمہ، مدینہ منورہ کے احوال بالخصوص اور حجاز کے معاملات بالعموم تفصیل سے درج ہیں، ضمناً بہت سے واقعات بیان میں آگئے ہیں جو کافی دلچسپ ہیں، ان میں بعض خاص طور سے اہم ہیں اور نادر ہیں، غرض کہ صراط الحمید جلد دوم کا بھی خاص رنگ ہے۔ جلد اول کے بعد جلد دوم پڑھنے سے لطف دوبالا ہوجاتا ہے، جلد دوم میں حرمین شریفین کے فوٹو بھی شامل ہیں۔"

برنی صاحب نے یہ سفرنامہ دوران سفر قلم بند کیا تھا، فرماتے ہیں:

"ایک ماہ اور چند یوم جو مدینہ منورہ میں حاضری رہی تو فرصت کے اوقات میں سفرنامہ لکھتا رہا اور بیشتر حصہ وہیں تحریر میں آیا، صرف آخری فصل جس میں واپسی کا ذکر ہے البتہ باقی رہ گئی تھی کہ وطن پہنچ کر لکھوں گا۔ توقع تھی کہ واپسی کے بعد ہی یہ سفرنامہ جلد شائع ہوجائے گا۔ لیکن عجیب اتفاق کہ سات سال گزر گئے اور طباعت کی نوبت نہ آسکی، مسودہ یونہی پڑا رہا، بلکہ ایک مرتبہ تو شبہ ہوا کہ گم ہوگیا، بارے خدا تلاش کیا تو وقت پر مل گیا۔

وجہ تاخیر یہ کہ واپسی کے بعد ہی گوناگوں مصروفیتوں کا ہجوم ہوگیا، یہ کام، وہ کام، علمی بھی، انتظامی بھی، خانگی بھی، سرکاری بھی، پھر اسی زمانے میں قادیانیوں سے

معرکے ہوئے جن کی تفصیلات ہماری کتاب "قادیانی مذہب" اور "قادیانی قول و فعل" میں درج ہیں، اپنی تو اکثر یہی حالت رہی اور رہتی ہے، علمی منصوبوں میں کتنے کام ابھی شروع نہ ہوسکے، کتنے کام برسوں سے ادھورے پڑے، ان میں جو بہت خاص ہیں ان کا اظہار و اعلان بھی قبل از وقت مناسب نہیں۔ تاہم جو کام تکمیل پاچکے خدا کا شکر ہے پچیس کتابیں جو شائع ہوچکی ہیں یہ اسی کا فضل ہے۔" (ج ۲- ص ۹ و ۷)

آگے لکھتے ہیں:

"صراط الحمید جلد اول میں دل کھل کھیلا، جب مچلا بول اٹھا ؎

کہہ گزرتا ہوں پتے کی بے خودی کے جوش میں | ہوش میں ہوتا نہیں، ہوتا ہوں جب میں ہوش میں

پھر بھی ضبط کی تاکید رہی۔ احتیاط کا اہتمام رہا۔ جلد دوم میں بھی دل کو کہیں کہیں موقع ملا، تاہم دماغ کا دور دورہ رہا کہ توازن لازم ہے ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل | لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

مگر سچ پوچھئے تو دھن بڑی چیز ہے۔ زندگی کی جان ہے سب دھنوں میں وہی دھن ؎

محمد از تو می خواہم خدا را | خدا از تو خواہم مصطفیٰ را

وہی توحید توحید ہے جو رسالت کے وسیلے سے نصیب ہو، رسول اللہ کو مانے تو اللہ کو جانے۔ اللہ تو سبحان اللہ۔ رسول اللہ ﷺ کی بھی کیا انوکھی شان ہے، صلوا علیہ وسلموا تسلیما ؎

ما بلبلیم نالاں گلزار ما محمد | ما نرگسیم حیراں، دیدار ما محمد

قمری بسرو نازد، بلبل بگل نزید | ما عاشقیم بے دل، دلدار ما محمد

از خویشتن ندانم جز این قدر که دانم
ما قطرہ ایم بحر ز خاک ما محمدؐ
(صلی اللہ علیہ وسلم)

یہ کتاب پہلی بار ۱۳۵۸ھ میں مطبع برقی اعظم جاہی حیدر آباد سے شائع کی گئی تھی۔

۱۰- برنی نامہ : صراط الحمید جلد اول میں چار درویش کی سرگزشت میں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۰ء تک حیدر آباد میں ۲۳ سال میں جو حالات پیش آئے تھے ان کا بیان ہے اور برنی نامہ میں اس کے بعد سے ۱۹۵۷ء تک سترہ برس کے قابل ذکر حالات و معاملات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ برنی صاحب لکھتے ہیں :

"میری خوش نصیبی یہ کہ حیدر آباد پہنچا، یہاں کے بزرگوں کا کیا کہنا ماشاء اللہ حقائق و معارف کے چمن کھلے ہوئے ہیں البتہ ع ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است "[1]

برنی صاحب کے اس زمانہ میں جن دانشور، اہل علم و اہل قلم، صوفیہ اور عہدہ داروں سے تعلقات رہے انہیں نام بنام بتایا ہے،[2] فرمانروائے دکن میر عثمان خاں سے موصوف کے دیرینہ مراسم تھے، کنگ کوٹھی میں آنا جانا ان کا معمول تھا،[3] اس کی طرف اشارہ کیا ہے :

"۱۹۱۷ء سے ۱۹۵۷ء تک چالیس برس حیدر آباد میں گزارے، اس مدت میں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا سلسلہ بھی جاری تھا، چنانچہ چھوٹی بڑی اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں چالیس کے قریب کتابیں شائع ہو چکی تھیں اور کئی منصوبے تکمیل طلب باقی تھے"۔[4]

۱۱- علم المعیشت : اردو میں اکنامکس کے موضوع پر سب سے پہلی نہایت مستند و جامع کتاب ہے، مشکل سے مشکل معاشی اصول و مسائل کو دلچسپ اور سلیس پیرایہ میں

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۹ و ۱۰ [2] برنی نامہ ص ۵ [3] ایضاً ص ۲۴ [4] ایضاً ص ۲۶۔

بیان کیا ہے، اس کے مطالعہ سے نئے نئے مضامین بخوبی ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور طلبہ و استاد سب اس کو شوق سے پڑھتے اور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

برنی صاحب نے کتاب علم المعیشت مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کی فرمائش و ہمت افزائی پر لکھنی شروع کی تھی،[1] یہ وہ زمانہ تھا جب کہ موصوف کی ایم اے اور ایل ایل بی کی تعلیم جاری تھی[2] اور وہ علی گڑھ کالج میں بی اے کے طلبہ کو معاشیات بھی پڑھاتے تھے اور ان کا کاروان عمر ابھی چھبیسویں منزل طے کر رہا تھا، یہ اردو میں سات سو صفحات سے زیادہ کی کتاب پہلی بار ۱۹۱۷ء میں انجمن ترقی اردو نے شائع کی تھی۔ برنی صاحب نے اس کی تمہید علی گڑھ کالج میں لکھی تھی۔

اس کتاب کے متعلق ایک بالغ نظر، ہوشمند و دانشور عالم مولانا عبید اللہ سندھی المتوفی ۱۹۴۴ء کی رائے یہ ہے :

"یورپ میں میری سیاحت کے لئے مولوی الیاس صاحب برنی کی "علم المعیشت" بھی ایک محسن کتاب ہے۔ اگر یہ کتاب مجھے نہ ملتی تو میں یورپ اقتصادی پروگرام کو سمجھنے کے قابل نہ ہوتا"۔[3]

یہ اس صاحب علم شخص کی رائے ہے جس نے اس فن کی تحصیل کسی کالج یا یونیورسٹی میں نہیں کی تھی۔ صرف اس کتاب کے مطالعہ سے ایسی بصیرت حاصل کی تھی کہ پورے یورپ کی علم المعیشت کو بخوبی سمجھ گئے تھے۔ موصوف نے اسے اپنی محسن کتابوں میں شمار کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبالؒ المتوفی ۱۹۳۸ء جو خود بھی معاشیات کے بڑے عالم اور دنیا کے نامور دانشوروں میں سے ہیں وہ اس کتاب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۳۴۹ [2] ایضاً [3] مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، مطبوعہ لکھنؤ ص ۲۵۔

"آپ کی کتاب "علم المعیشت" اردو زبان پر احسان عظیم ہے اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ اکنامکس پر اردو میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے اور ہر لحاظ سے مکمل"۔ [1]

کتاب کے خاتمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ سے کتنا عشق تھا اور ان کا ایمان کس قدر راسخ تھا تحریر فرماتے ہیں:۔

"علم المعیشت" کا بیان ختم ہوتا ہے اب صرف آخری نکتہ جتنا باقی ہے اگر کل پہلوؤں پر غور کرکے بنی نوع انسان اپنی زندگی کے واسطے بہترین معاشی اصول دریافت کرنا چاہے تو اس کی ہدایت کے واسطے اللہ جل شانہ نے دریائے حکمت کو کوزہ میں بند کردیا ہے، قرآن پاک میں معاشی زندگی کے متعلق بہت سی ہدایتیں موجود ہیں اور صدہا سال کا تجربہ بھی آج انہی ہدایات کا موید نظر آتا ہے۔ ہم صرف ایک آیت شریفہ پر اکتفا کرتے ہیں وھو ھذا۔

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا — اور کھاؤ اور پیو اور بے جا خرچ نہ
إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ۔ — کرو، اس کو خوش نہیں آتے بے جا
(اعراف ۷: ۳۱) — خرچ کرنے والے۔

اس کتاب کے سرورق کی پیشانی پر یہ آیت شریفہ:

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ — اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے
لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا (طٰہٰ ۱۲۴) — تو اس کی ملنی ہے گذران تنگی کی۔

دوبارہ یہ کتاب باہتمام محمد مقتدیٰ شروانی مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ سے ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء میں شائع کی گئی تھی۔ تیسرا ایڈیشن ۸۰۰ صفحات پر مشتمل انجمن ترقی

[1] فہرست کتب الیاس برنی ص ۱۲۔ یہ فہرست صراط الحمید جلد دوم کے آخر میں شایع کی گئی ہے۔

اردو دہلی سے نکلا ہے۔

۱۲۔ اصول معاشیات: یہ کتاب نصابی ضرورت کے تحت مرتب کی گئی ہے اس لئے کسی قدر دقیق اور مشکل مباحث پر مشتمل ہے، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے شائع کی تھی۔ صفحات ۶۰۰ ہیں، خوشنما جلد اور تقطیع کلاں ہے۔

۱۳۔ معیشت الہند: ہندوستان کے گوناگوں معاشی حالات جن کا جاننا ملک کی اصلاح و ترقی کے لئے ازحد ضروری ہے، کافی تحقیق اور تنقید کے بعد بہت سلیس اور دلچسپ طرز پر علمی پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔

اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی جامع و مستند کتاب دارالترجمہ جامعہ حیدرآباد سے شائع کی گئی تھی۔ ۸۵۰ صفحات، تقطیع کلاں اور جلد خوش نما ہے۔ ۱۳۴۴ھ میں دوسری بار شائع کی گئی تھی۔

۱۴۔ مقدمۃ المعاشیات: یہ مورلینڈ کی انگریزی کتاب "انٹروڈکشن ٹو اکنامکس" کا سلیس و بامحاورہ اردو ترجمہ ہے جس میں معاشیات کے ابتدائی اصول و مسائل بیان کئے گئے ہیں، تقطیع کلاں، ۳۰۰ صفحات ہیں، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے شائع کی تھی۔

برنی صاحب کا ایک سلسلہ تصانیف منتخبات نظم اردو پر مشتمل ہے۔ اردو شاعری میں غزلیات کا وافر ذخیرہ ہونے کی بنا پر عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ساری کائنات محض حسن و عشق اور گل و بلبل کی داستان ہے، مگر تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو میں ہر رنگ کی بہتر سے بہتر نظمیں موجود ہیں لیکن وہ نظروں سے اوجھل تھیں۔ برنی صاحب کے اس انتخاب سے یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ اردو کا دامن اس سلسلہ میں کتنا وسیع ہے۔

یہ معارف ملت' جذبات فطرت اور مناظر قدرت کے نام سے قدیم و جدید اردو شعراء کی نظموں کا ایک مفید اور جامع انتخاب ہے جو بارہ حصوں پر مشتمل ہے، اس میں اردو کے تقریباً دو سو قدیم و جدید نامور شعراء کا بہترین کلام عجیب و غریب ترتیب کے ساتھ آگیا ہے۔ بڑے بڑے ادیب اور نقاد سخن نے اس کی داد دی ہے اور یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا اس سے واقعتاً لائق مرتب کی اردو ادب پر وسیع نظر اور سخن فہمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۹ء سے بتدریج شائع ہوتا رہا اور ۱۹۲۴ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔

۱۵ تا ۱۸: اس کا پہلا سیٹ معارف ملت چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

۱۹ تا ۲۲: دوسرا سیٹ جذبات فطرت کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کی جلد اول اردو شاعری کے قافلہ سالار میر تقی میر و رفیع سودا کے کلام کا انتخاب ہے۔

جلد دوم۔ مرزا غالب' ذوق، ظفر، حسرت موہانی کے کلام کا انتخاب ہے۔

جلد سوم۔ تقریباً بیس قدیم و مستند اور باکمال شعراء کے کلام کا انتخاب ہے۔

جلد چہارم۔ تقریباً ساٹھ جدید مشہور و مقبول شعراء کے کلام کا دلکش انتخاب ہے۔

۲۳ تا ۲۶: تیسرا سیٹ۔ مناظر قدرت: جلد اول متعلق اوقات، صبح و شام' دن رات' دھوپ' چاندنی' موسم گرما، سرما، برسات اور بہار کے دلکش مناظر نظموں میں اس خوبی سے عکس فگن ہیں' ان کو دیکھ کر طبیعت وجد کرنے لگتی ہے۔ یہ جلد قدرت کی دل فریبیوں کا بہترین مرقع ہے۔

جلد دوم (کائنات اور اس کی اشیا)، اس میں آسمان، زمین، پہاڑ، جنگل' میدان' دریا، کھیت' باغات' شہر اور عمارات وغیرہ کی شعراء نے ایسی تصویر کھینچی ہے کہ نظمیں پڑھتے وقت گویا ہم آنکھوں سے ان کی سیر کر رہے ہیں۔

جلد سوم (نباتات و حیوانات) میں نباتات و حیوانات یعنی پھول پھل' کیڑے، پتنگے' تتلیاں' پرند و چرند وغیرہ کے متعلق نظمیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے شاعروں نے اشیائے قدرت کا کس حد تک مطالعہ کیا ہے اور مشاہدات میں کہاں تک جان ڈالی ہے۔

جلد چہارم (عمرانیات)، اس میں ہندوستان کے تمدن' رسم و رواج، عید تہوار' شادی، میلے، ٹھیلے، کھیل تماشے' بزم و رزم کے حالات دل کو بے چین کر دیتے ہیں' شعر و سخن کا یہ عجیب دل کش انتخاب ہے۔ ان تینوں سیٹ کی پہلی بار ۱۹۱۹ء میں اشاعت ہوئی۔ تیسری بار محمد مقتدیٰ خاں شیروانی کے زیر اہتمام ۱۹۲۴ء میں علی گڑھ سے شائع کئے گئے تھے۔

عطیہ قادریہ: یہ تحفہ ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ میں یازدہم شریف میں بلا قیمت تقسیم ہوا۔

برنی کی تصانیف و تراجم کی تعداد الیاس برنی صاحب نے اپنی تصانیف و تراجم کی تعداد "۴۰" بیان کی ہے اور مولانا منت اللہ صاحب نے برنی صاحب کی تصانیف کی تعداد "۴۹" بتائی ہے[1]

برنی صاحب کی حیات میں ان کی کتابوں کے ناشر، ادارے، مکتبے اور مطابع مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد حیدرآباد دکن۔

۲۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ' حیدرآباد۔

۳۔ مکتبہ ابراہیمیہ (عابد شاپ) "

[1] مکاتیب گیلانی ج ۱ ص ۱۰۴

۴۔ اختر دکن پریس، افضل گنج، حیدرآباد

۵۔ محمد الیاس۔ جام باغ ترپ بازار " (حیدرآباد میں قیام کے ابتدائی زمانے میں)، پھر بیت السلام دیسف آباد۔ "

۶۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی۔ منیجر مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ۔

۷۔ مکتبہ جامعہ ملیہ۔ دہلی۔

۸۔ تاج کمپنی لاہور۔ کراچی۔

۹۔ محمد اشرف لاہور۔

برنی صاحب کی فارمیسی اکسیر انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد، جہاں برنی صاحب کے مجربات تیار ہوتے تھے۔

۱۔ اکسیر کبیر: معدہ کی شکایات میں مفید ہے۔

۲۔ اکسیر آئل: جسم کے درد، ورم، نزلہ، زکام، انفلوئنزا میں مفید ہے۔

۳۔ اکسیر مرہم: جلدی امراض کے لئے مفید ہے۔

۴۔ اکسیر دندان: خوشبودار ٹوتھ پیسٹ، دانتوں کی شکایات میں مفید ہے۔

مزید برآں بعض موذی امراض جو بالعموم لاعلاج مانے جاتے ہیں۔ بالخصوص جذام کینسر ایسے امراض کا بھی علاج بطور خاص کیا جاتا تھا۔

یہ فارمیسی اکسیر انسٹی ٹیوٹ موصوف نے ۱۹۵۸ء میں یا اس سے کچھ عرصہ پہلے قائم کیا تھا۔

سید عبدالوہاب بخاریؒ کی
"تفسیر القرآن"

از ڈاکٹر محمد شفقت اللہ صاحب ٭

سید عبدالوہاب بخاریؒ، سید جلال الدین مخدوم جہانیاںؒ کی اولاد و احفاد میں سے ہیں۔[1] ان کا خاندان ایک عرصے تک علم و دانش اور وعظ و ارشاد کا متوارث رہا۔ سید عبدالوہاب بخاری کے والد کا نام محمد الحسینی البخاری اور دادا کا نام رفیع الدین الحسینی البخاری تھا۔[2] ان کی والدہ کا نام فاطمہ تھا جو سید قطب الدین الحسینی البخاری کی صاحبزادی تھیں۔[3]

سید عبدالوہاب بخاریؒ نے قرآن حکیم کی ایک تفسیر لکھی جو "تفسیر القرآن" کے نام سے متعارف ہے۔ مولف نے قرآن مجید کی ہر آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت و منقبت ثابت کرنے کی سعی کی ہے۔ تفسیر کا یہ پہلو اسے دوسری تفاسیر سے ایک جداگانہ حیثیت دیتا ہے۔ اس تفسیر کے تعارف و تجزیہ سے پہلے مولفِ موصوف کے حالاتِ زندگی اختصار سے بیان کئے جاتے ہیں تاکہ ان کی اس دینی تربیت اور متصوفانہ طبیعت کا اندازہ ہو سکے، جس سے ان کے صوفیانہ مزاج کی تشکیل ہوئی اور انہوں نے ایسی تفسیر تالیف کی۔

سید عبدالوہاب بخاریؒ کی ولادت ۸۶۹ھ میں اُچ میں ہوئی اور انہوں نے اسی شہر

٭ اسوسیٹ پروفیسر شعبۂ عربی، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان (پاکستان)

میں پرورش پائی[4] سید مناظر احسن گیلانی نے ملتان کو ان کا مولد قرار دیا ہے[5] جو درست نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ ان کی ولادت اُچ میں ہوئی۔ جیسا کہ عبدالحئی الحسنیؒ نے اس کی تصریح کی ہے[6]

سید عبدالوہاب بخاریؒ نے ملتان میں سید صدرالدین بخاریؒ سے علم حاصل کیا[7] اور بعد ازاں انہیں کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ ان کے استاد و مرشد نے انہیں اپنی بیٹی کا رشتہ دے کر اپنا داماد بنا لیا تو انہوں نے ملتان میں سکونت اختیار کرلی اور اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں رہنے لگے تاکہ ان سے زیادہ سے زیادہ علمی و روحانی استفادہ کرسکیں[8]

سید صدرالدین بخاری حسینی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبے سے سرشار تھے اور وہ جذب کی اس کیفیت کو اپنے متعلقین و متوسلین میں بھی عام کرنا چاہتے تھے۔ ایک روز سید عبدالوہاب کے دل میں اپنے پیر و مرشد کے ارشادات سن کر مدینہ طیبہ جانے کا شوق موجزن ہوگیا اور وہ اپنے استاد و مرشد کی محفل برخواست ہونے پر ان سے مدینہ طیبہ جانے کی اجازت طلب کرکے عازمِ سفر ہوئے اور اس طرح حج و زیارت کی سعادت سے شرف یاب ہوئے[9] حجاز مقدس کے اس مبارک سفر اور وہاں پر مناسکِ حج کی ادائیگی کے بعد ہندوستان میں اپنے وطن ملتان واپس آگئے اور کچھ عرصہ یہاں قیام پذیر رہے[10]

سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں بعض وجوہات کی بنا پر وہ ملتان سے ترک سکونت کرکے دہلی چلے گئے اور وہیں پر گھر بنایا اور توطن اختیار کرلیا[11] محمد غوثی شطاری مانڈویؒ رقمطراز ہیں:

"سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں دہلی آکر گھر بنایا اور گھر والی بھی بہم پہنچائی"[12]

اس سے متبادر ہوتا ہے کہ انہوں نے دہلی میں گھر بنانے کے بعد شادی بھی کی اور نکاح بھی دہلی یا کہیں اس کے مضافات میں کیا۔ شطاری مانڈوی کا یہ بیان صحیح نہیں۔ ان کی شادی کے بارے میں شطاری مانڈوی سے سہو ہوا ہے کیونکہ ان کی شادی ملتان میں اپنے استاد و مربی صدرالدین بخاریؒ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ جیسا کہ ہم اس مختصر مقالے میں اس سے پہلے تصریح کرچکے ہیں کہ وہ جب پہلی مرتبہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت اور حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے لئے ملتان سے روانہ ہوئے تھے تو وہ شادی شدہ تھے۔ ہمارے موقف کی تائید سید مناظر احسن گیلانی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے:

"ملتان میں سے یہ متاہل ہونے کے بعد ایک خاص جذبہ کے تحت، براہ خشکی بزیارت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بشتافت"[13]

سکندر لودھی ان کا بہت معتقد تھا اور ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتا تھا[14] دہلی میں قیام کے دوران انہیں شاہ عبداللہ بن یوسف قریشی ملتانیؒ سے عقیدت ہوگئی تو ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہوگئے اور ان کی صحبت اختیار کرلی۔ شاہ عبداللہؒ سے ان کی محبت و عقیدت کا یہ عالم تھا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے ان کو فنافی الشیخ بتایا ہے اور ان دونوں مرشد و مسترشد کے باہمی احترام و عقیدت کو مولانا روم اور شمس تبریز قدس اللہ اسرارہما کے باہمی تعلقِ خاطر سے تشبیہ دی ہے[15]

دہلی میں سکونت اختیار کرلینے کے بعد ان کے دل میں ایک بار پھر حجازِ مقدس کے سفر اور حج و زیارت کی آرزو پیدا ہوئی تو وہ دوسری بار حج کے لئے روانہ ہوئے۔ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت سے قلب و نظر کو سکون پہنچانے اور مناسک حج ادا کرنے کے بعد دہلی

واپس لوٹ آئے اور تادمِ مرگ اسی شہر میں مقیم رہے [16]

سید عبدالوہاب بخاریؒ ایک صوفی منش، مجذوب طبع اور جہاں گشت و سیلانی فقیر تھے، مناظر احسن گیلانیؒ نے لکھا ہے:

"ایک دفعہ نہیں متعدد بار ممالکِ اسلامیہ کی سیر کی اور حجاز آتے جاتے رہے" [17]

انہوں نے ۹۳۲ء میں تریسٹھ سال کی عمر میں دہلی میں انتقال کیا۔ شیخ محمد غوثی شطاری مانڈویؒ نے ان کا سال وفات ۹۳۰ء لکھا ہے [18] جو درست نہیں ہے، کیونکہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے:

"وفاتِ شیخ در ۹۳۲ھ اثنین وثلاثین وتسع مائۃ کہ عدد عبارت شیخ حاجی موافق آنست" [19]

تمام تذکرہ نگاروں کی نسبت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا زمانہ سید عبدالوہاب بخاری کے زمانے سے قریب تر ہے اور دونوں کا تعلق بھی ایک ہی شہر دہلی سے ہے۔ اس لئے اس بارے میں محدث دہلویؒ کے بیان کو شطاری مانڈویؒ کے قول پر ترجیح حاصل ہے جبکہ شیخ محمد غوثی شطاری مانڈوی دہلی سے دور جنوبی ہندوستان کے ایک شہر مانڈو کے رہنے والے تھے اور زمانی لحاظ سے محدث دہلویؒ سے متاخر بھی۔ شطاری مانڈوی کے علاوہ باقی تمام تذکرہ نگاروں شیخ عبدالحی الحسنیؒ [20] اسماعیل پاشا بغدادی [21]، عمر رضا کحالہ [22] اور عادل نویہض [23] وغیرہ نے ۹۳۲ھ کو ان کا سالِ وفات قرار دیا ہے۔ شیخ عبدالحیؒ حسنیؒ نے لکھا ہے کہ سید عبدالوہاب بخاریؒ نے اسی روز وفات پائی جس روز بابر فاتحانہ دہلی میں داخل ہوا [24]۔ صاحبِ معجم المفسرین نے عیسوی تقویم کے مطابق ۱۵۲۶ء کو ان کا سن وفات تحریر کیا ہے [25]۔ ان کا مدفن پرانی دہلی میں اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ عبداللہ بن یوسف قریشی ملتانیؒ کے

مقبرے کے جوار میں ہے [26]۔ وفات کے بعد بھی طویل عرصے تک دہلی شہر میں ان کی مجذوبیت کا شہرہ اور جذب و استغراق کا آوازہ بلند رہا۔ اہل دہلی ان کو "سید مچھی روٹی" کے عرف سے پکارتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے ملفوظات میں ان کے بارے میں ارشاد ہے:

"سید عبدالوہاب بخاریؒ کہ مشہور بہ "سید مچھی روٹی" در اینجا شہرت دارد" [27]

سید عبدالوہاب بخاریؒ کی اولاد کے بارے میں اس سے زیادہ معلوم نہیں کہ ان کا ابوالغیث نامی ایک بیٹا تھا جو مجذوب تھا۔ ان کا یہ فرزند اپنے باپ کی وفات کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا بلکہ اسی سال اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا جس سال سید عبدالوہاب بخاریؒ کی وفات ہوئی [28]

تصانیف: سید عبدالوہاب بخاریؒ کے تصنیفی آثار میں سے ایک قلیل حصہ ہم تک پہنچا ہے، اس کی وجہ شاید ان کا حبِ رسولؐ میں افراط ہے۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ لوگوں نے ان کی تصانیف کو ان کے غلبہ حال اور جذبِ دروں کی کیفیت کا آئینہ دار قرار دیتے ہوئے علمی قدر و منزلت کا حامل نہ سمجھا ہو اور اسی بنا پر ان پر مناسب توجہ نہ دی ہو۔ اس طرح ان کی تصانیف اہلِ زمانہ کی توجہ کا مرکز نہ بن سکی ہوں اور دست بردکا شکار ہوگئی ہوں۔ تاہم ان کی مندرجہ ذیل تصانیف کے نام ملتے ہیں:

۱۔ **تفسیر القرآن**: اکثر تذکرہ نگاروں نے انکی اس تصنیف کا ذکر کیا، اس کے صرف چند اقتباسات دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہ گئے ہیں۔ ہم اس تفسیر کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے کلام کریں گے۔

۲۔ **رسالۃ فی شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم**: سید عبدالحیؒ حسنیؒ نے اس رسالے کو سید عبدالوہاب بخاریؒ کی تصنیف قرار دیا ہے [29]۔ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں

اورینٹیل سٹڈیز کی قلمی کتابوں (مخطوطات) کے بارے میں لکھے گئے کیٹلاگ اور فہارس سے ہمیں کسی کتب خانے میں اس کی موجودگی کا پتہ نہیں چلا۔ شاید یہ رسالہ دنیا سے ناپید ہوگیا ہے۔

۳۔ قصائد بالعربیۃ فی مدحہ صلی اللہ علیہ وسلم: سید عبدالوہاب بخاری کی اس عقیدت مندانہ کاوش کا ذکر عبدالحئی الحسنیؒ نے "نزہتہ الخواطر" میں کیا ہے۔[۳۰] اس کے علاوہ کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصائد بھی مفقود ہو چکے ہیں۔

تفسیر القرآن ہر تصنیف اپنے مصنف کی ذہنیت کی عکاس اور اس کے فکری افتاد کی غماز ہوتی ہے۔ جس کے مندرجات سے مصنف کی علمی شخصیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اہلِ علم اور اربابِ فن کو جن علوم و فنون کے شعبوں میں خصوصی دستگاہ حاصل ہوتی ہے وہ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھائیں تو اس میں ان کے خاص فن کی چھاپ واضح طور پر کارفرما نظر آتی ہے۔ مفسرینِ کرام کی صورت حال بھی اس سے مختلف نہیں کیونکہ ان حضرات کو جن ادبی و لسانی، عقلی و کلامی یا دینی و اسلامی علوم میں درک حاصل ہوتا ہے اس کا اظہار ان کی تفاسیر کے مباحث سے ہوتا ہے چنانچہ امام سیوطیؒ لکھتے ہیں:

فکان کل منهم یقتصر	مفسرین میں سے ہر ایک اپنی تفسیر کو
فی تفسیرہ علی الفن الذی	اس علم و فن کے مباحث میں محدود
یغلب علیه [۳۱]	کر دیتا تھا جس میں اسے کمال حاصل ہوتا تھا۔

علم نحو کے ماہرین اپنی تفاسیر میں اعراب اور ان کے وجوہ، نحو کے قواعد و مسائل اور ان کے اصول و فروع کے بارے میں موشگافیاں کرتے تھے۔ واحدی کی "البسیط" اور ابوحیان کی "البحر المحیط" اور "النہر الماد" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اخبار و مغازی اور علم تاریخ کا ذوق رکھنے والا کوئی عالم تفسیر لکھتا تو وہ گزشتہ قوموں کے قصوں اور خبروں کا اپنی تفسیر میں کثرت سے ذکر کرتا۔ ثعلبی کی تفسیر اس نوع کی تفاسیر سے تعلق رکھتی ہے۔ فقہی ذوق سے مالامال افراد اپنی تفاسیر میں عقائد و عبادات اور معاملات کے اصولی و فروعی مسائل اور ان کے دلائل کے انبار لگا دیتے۔ اسی طرح علوم عقلیہ اور فلسفہ و کلام میں مہارت و دلچسپی رکھنے والے علما اپنی تفاسیر کو حکیمانہ مباحث اور فلسفیانہ مسائل سے آراستہ کرتے جیسا کہ فخرالدین رازیؒ کی "التفسیر الکبیر" علوم عقلیہ کی روشنی میں تفسیری مباحث کا احاطہ کرتی ہے۔[۳۲]

سید عبدالوہاب بخاریؒ کی تفسیر ان کے صوفیانہ مشرب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے انتہائی عقیدت مندانہ جذبے کا اظہار کرتی ہے۔ بچپن سے ان کی تربیت خانقاہی ماحول میں ہوئی۔ ان کے اساتذہ سید صدرالدین بخاری ملتانیؒ اور شاہ عبداللہ قریشی ملتانی ثم دہلویؒ دونوں مرتاض صوفی بزرگ تھے۔ سید عبدالوہاب اپنے اپنے اساتذہ کے ساتھ ایسی عقیدت و محبت اور تعظیم و احترام سے پیش آتے جیسے فنافی الشیخ کہنا چاہیے وہ شب و روز اپنے اساتذہ اور شیوخ کی خدمت میں حاضر رہتے حتیٰ کہ ان کے جذب و حال کے اوقات میں بھی ان کے پاس موجود ہوتے اور ان سے استفادہ و استفاضہ اور کسب و آموزش کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے اس سے خود ان کی اپنی شخصیت میں مجذوبیت کے اثرات سرایت کر گئے اور کبھی کبھی خود ان پر بھی جذب و مستی کی کیفیات طاری ہوتیں۔ اسی استغراق اور غلبۂ حال میں ایک بار انہوں نے گھر بار اور عزیز و اقارب کو چھوڑ کر

مدینہ منورہ کی راہ لی تھی۔ انہوں نے اپنی تفسیر بھی استغراق اور غلبۂ حال میں لکھی تھی، جو ان کے مجذوبانہ افکار کی آئینہ دار ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

"شیخ عبدالوہاب کی ایک تفسیر ہے جس میں انہوں نے اکثر بلکہ تمام مطالبِ قرآنی کو (تاویل کرکے) حضرت رسول کریمؐ کی تعریف اور آپ کے ذکر مبارک کی طرف لوٹایا ہے۔ اس میں انہوں نے عشق کے نکتے اور محبت کے اسرار کثرت سے درج کئے ہیں، شاید غلبۂ حال اور استغراق عشق کے عالم میں ان سے ایسی تفسیر کا صدور ہوا ہے۔ اسی وجہ سے بعض مقامات پر قرآنی الفاظ و عبارات کے ظواہر کا خیال نہیں رکھا گیا ہے"[۳۳]

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے بھی ان کے اس تفسیری رجحان کو بیان کیا ہے۔ لیکن اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا وہ فرماتے ہیں:

"انہوں نے اپنی تفسیر میں تمام قرآن مجید کو نبی کریمؐ کی نعت قرار دے دیا تھا"[۳۴]

علامہ عبدالحیٔ حسنیؒ نے بھی اس تفسیر کے بارے میں اپنے انہی خیالات کا اظہار کیا ہے جو شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے بیان کئے ہیں۔ البتہ انہوں نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ اس تفسیر کا اکثر و بیشتر حصہ صحت و صواب کے منافی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں۔

"اس بات کا احتمال ہے کہ یہ تفسیر انہوں نے اپنے غلبۂ حال میں تصنیف کی ہو کیونکہ جن امور و مسائل کا انہوں نے ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر صحیح نہیں ہیں"[۳۵]

پورے قرآن مجید اور اس کی ہر ایک آیت کو رسول پاکؐ کی تعریف قرار دینا ایک ایسا دعویٰ اور اس کے اثبات کے لئے کوشش کرنا ایک ایسا عمل ہے جو بذات خود قرآن وحدیث کی تعلیمات، تعامل صحابہ اور سلف صالحین کے طریقے کے خلاف ہے کیونکہ

قرآن مجید میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و عظمت اور آپؐ کی حیثیت و اہمیت کو کما حقہٗ بیان کرنے کے باوجود کوئی صریح نص وارد نہیں جس سے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہو، بلکہ قرآن کریم میں تو انبیائے سابقینؑ اور ان کی امتوں کا ذکر آیا ہے۔ اسی طرح گمراہ قوم سے مخاصمہ اور مجادلہ کی آیات وارد ہوئی ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی فکری و عملی کوتاہیوں کو آشکارا کیا گیا ہے۔ اسلامی عقائد کی تصریح اور مسلمانوں کی عملی زندگی کے لئے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ قرآن حکیم میں دنیا کی عارضی و فانی زندگی اور آخرت کی دائمی و ابدی حیات کی توضیح کے ساتھ ساتھ عدل و میزان اور حشر و نشر کی وضاحت کی گئی ہے۔ کفار و مشرکین کو جہنم کے ہولناک اور دائمی عذاب کی تہدید اور صالح مومنین کو جنت میں ہمیشہ ہمیشہ کی نعمتوں اور آسائشوں کی خوش خبری دی گئی ہے۔ احادیث کی بڑی بڑی کتابوں کا ایک مستقل حصہ کتاب التفسیر پر مشتمل ہوتا ہے جس میں مختلف سورتوں اور آیتوں کے بارے میں خود صاحب قرآن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر و توضیح اور تشریح وارد ہوئی ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ و عبارات سے صحابۂ کرامؓ کے علمی نکات اور فقہی احکام کے استخراج و استنباط کا ریکارڈ بھی موجود ہے۔ قرآن کریم کے مطالب و مفاہیم کی تعیین کے لئے تابعینِ عظامؒ اور علمائے کرام کے اقوال وارشادات بھی مدون شکل میں میسر ہیں لیکن کہیں بھی نہ تو اس قسم کا کوئی دعویٰ کیا گیا ہے اور نہ ہی اس کے اثبات کی کسی کوشش کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا دعویٰ اور اس کا اثبات غیر مناسب بلکہ غیر صحیح ہے۔ سید مناظر احسن گیلانی نے اس تفسیر کے بارے میں لکھا ہے:

"الحمد سے لے کر والناس تک قرآن اور قرآن مجید کی ہر ایک آیت سے آنحضرت

یہ معنی پیدا کیا کہ اس میں رسول کریمؐ کی تعریف اور نعت بیان کی گئی ہے۔ یہ صرف دعویٰ ہوتا تو غنیمت تھا پوری تفسیر اس دعویٰ کے اثبات میں لکھ ڈالی۔ اس قسم کی تفسیر کے بارے میں جو کہا جا سکتا ہے وہ ظاہر ہے"۔[۳۶]

اس تفسیر کا نہ تو کوئی مکمل نسخہ دستیاب ہے اور نہ ہی اس کا مقدمہ میسر آسکا جس سے سید عبدالوہاب جیسے صوفی مزاج اور محب رسولؐ مفسر کی تفسیر نگاری کے اہداف و مقاصد سے آگاہی اور ان کی تالیف کے مصادر و مراجع کا صحیح علم ہو سکے۔ لیکن سید عبدالوہاب بخاریؒ اور ان کی تفسیر کے متعلق جو قلیل مواد دستیاب ہو سکا ہے اس پر انتہائی غور و خوض سے ہم اس تفسیر کے سبب تالیف اور مصادر و مراجع کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ سید عبدالوہاب بخاریؒ نے صرف دو حضرات سید صدرالدین بخاریؒ اور شاہ عبداللہ قریشی ملتانی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ وہ بچپن میں سید صدرالدین بخاریؒ کے زیر تربیت رہے، ان کے مرشد و مربی نے اوائل عمر ہی سے رسول کریمؐ کی محبت ان کی گھٹی میں ڈالی اور پھر وہ پوری مدت تربیت کے دوران ہونہار شاگرد رہے اور حب رسولؐ کے اس ذوق کو پروان چڑھاتے رہے حتی کہ ایک روز سید عبدالوہاب بخاریؒ اپنے مرشد سے اجازت لے کر مدینہ طیبہ کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ بعد میں جب وہ دہلی میں قیام پذیر ہو گئے تو وہاں شاہ عبداللہ قریشی ملتانیؒ سے متاثر ہوئے جو مجاہدہ و ریاضت میں اپنی مثال آپ تھے۔ سید عبدالوہاب بخاریؒ ان کی شاگردی اختیار کر کے کسب فیض کرنے لگے۔ شاہ عبداللہ قریشی ملتانیؒ ان پر انتہائی توجہ فرماتے اور انہیں وہ علوم بھی سکھاتے جن کا مصدر و منبع ان کے مجاہدہ و ریاضت سے حاصل شدہ فراست و بصیرت اور کشف و الہام تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے تفسیر القرآن کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"شیخ حاجی عبدالوہاب در تفسیر	ایک رات میں دانشمند مجنونوں
خود می نویسد: یاھذ نا انی کنت	کے امیر عبداللہ بن یوسف قریشی کی
لیلۃ فی خدمۃ مرشدی	خدمت میں حاضر تھا۔ وہ مجھے ان
رئیس العقلاء المجانین عبداللہ	علوم کے کئی مسائل سکھا رہے تھے،
ابن یوسف القرشی۔ وکان	جن کی اللہ تعالیٰ نے انہیں تعلیم دی
یعلمنی مما علمہ اللہ	تھی۔ پس (اس دوران) ان کی گفتگو
فلما انتھیٰ الیٰ کیفیۃ	جب مشاہدۂ حق کی کیفیت پر پہنچی
المشاھدۃ فقال: ان	تو فرمانے لگے: یقیناً یہ علم احاطۂ تقریر
ھذا العلم لایدخل فی	میں نہیں آسکتا (یعنی اسے باتوں کے
التقریر، ولکن اذ حصل	ذریعے نہیں سمجھایا جا سکتا) لیکن جب
واسترشد یرشد وقال	(جذبۂ صادق سے) اس کی تحصیل
ذلک لان القلوب فی کونھا	و طلب کی جائے (تو خداوند کریم کی
وعاءً لاحوال متفاوتۃ	جانب سے اس کی طرف) رہنمائی کی
لایوجد قلبان متفقان	جاتی ہے۔ ایسا اس لئے ہے کیوں کہ
فی وجدان ثمرات	دل مختلف احوال و کیفیات کے
الاحوال اصلاً فکل قلب	ظروف (برتن) ہیں۔ لیکن کوئی دو
لہ لذۃ غیر لذۃ قلب	دل بھی احوال و کیفیات کے ثمرات

غیرہ۔[۳۷]

کے ادراک و بصیرت میں بالکل
ایک جیسے نہیں ہیں۔ پس ہر ایک
دل کا ذوق دوسرے دل کے ذوق
سے مختلف ہے۔

ان تصریحات کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس تفسیر کے لکھنے کا سبب اور جذبۂ محرکہ، رسول کریمؐ کی ذات سے ان کی عقیدت و وابستگی ہے۔ یہ عقیدت و وابستگی جو ابتدائے کار سے ان کے دل میں پیدا ہوئی اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پختہ اور راسخ ہوتی گئی۔ اس کا داعیہ تو پہلے ہی موجود تھا۔ لیکن اساتذہ، تعلیمی ماحول اور مکتب و خانقاہ کی فضا نے انہیں اور بھی اس رنگ میں رنگ دیا۔ جہاں تک اس تفسیر کے مصادر و مراجع کا تعلق ہے تو اس تفسیر کے مذکورہ بالا اقتباس کے جملے "وکان یعلمنی مما علمہ اللہ" (میرے مرشد مجھے ان علوم میں سے کچھ امور و مسائل کی تعلیم دیتے تھے جو علوم انہیں اللہ تعالیٰ نے سکھائے تھے) سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دوسرے صوفیہ کی طرح کشف والہام کو علم کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔ اس جملے کے الفاظ مما علمہ اللہ سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اپنے مرشد کو علوم وہبی کا عالم سمجھتے تھے۔ ان کے مرشد و مربی پہلے تو ان کو اپنے وہبی ولدنی علم سے بہرہ یاب کرتے رہے بعد میں انہوں نے اپنے تلمیذ و مرید کو وہبی ولدنی علوم تک رسائی اور ان کے حصول کا طریقہ بھی سکھا دیا۔ تفسیر القرآن کی تالیف کے وقت سید عبدالوہاب بخاریؒ پر جو قلبی و روحانی واردات طاری ہوتیں وہ انہیں غلبۂ حال اور استغراق کے عالم میں رقم کر لیتے تھے۔ اس لئے ان سے تفسیر نگاری کے حدود و قیود کی پاسداری نہیں ہو سکی۔ ان کی بہت ساری تاویلات، شطحیات[۳۸] کے قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی

تاویلات کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ وہ قرآنی الفاظ و عبارات کے سیاق و سباق اور شان نزول کی پرواہ کئے بغیر زبردستی ان سے رسول پاکؐ کی مدحت و منقبت کے پہلو نکال رہے ہیں اور آیات قرآنی کی تفسیر میں انہوں نے جو توجیہات کی ہیں ان کا ماخذ و مصدر خود ان کا اپنا ذوق و وجدان اور کشف و الہام ہے یا ان کے مرشد کا وہ فیضان ہے جو مرشد نے انہیں اپنے وہبی علوم سے عطا کیا تھا۔

تفسیر القرآن کے صرف چند اقتباسات ملتے ہیں جو سورۃ مریم، سورۃ طٰہ، سورۂ انبیاء اور سورۂ حج کی چند آیات کی تفسیر پر مشتمل ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ سورۃ مریم

اس سورۂ مجیدہ کی مندرجہ ذیل آیات کی تفسیر ملتی ہے:

(الف) پہلی، تیسری، بارہویں، تیرہویں، پندرہویں، سولہویں، پچاسویں، باسٹھویں، تریسٹھویں، سترویں۔

(ب) اس سورہ کی آیت (وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآئِیْ وَکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا) میں سے صرف "اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآئِیْ" کی تفسیر ملتی ہے۔ مولف نے آیت کے دیگر الفاظ کی تفسیر نہیں کی۔

(ج) اس سورہ کی چھہترویں آیت (وَیَزِیْدُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اهْتَدَوْا هُدًی وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ مَّرَدًّا) میں سے صرف آیت کے آخری حصے "والباقیات الصالحات سے خیر مردا تک" کی تفسیر موجود ہے۔ مولف نے آیت کے اس سے ماقبل الفاظ کی تفسیر نہیں کی۔

۲۔ سورۃ طٰہ

(الف) اس سورۂ شریفہ کی دوسری، تیسری اور گیارہویں آیت کی تفسیر میسر ہے

(ب) اس سورہ کی بارہویں آیت (اِنِّیٓ اَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی) میں سے "اِنِّیٓ اَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ" کے الفاظ کی تفسیر ملتی ہے۔

۳۔ سورۃ الانبیاء

تفسیر القرآن میں سے اس سورہ کی صرف سترہویں آیت (لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَہْوًا لَّاتَّخَذْنٰہُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ کُنَّا فٰعِلِیْنَ) کی تفسیر کا اقتباس موجود ہے۔

۴۔ سورۃ حج

(الف) اس سورہ شریفہ کی چھبیسویں اور سترویں آیات کے تمام و کمال الفاظ و عبارات کی تفسیر میسر ہے۔

(ب) اس سورہ کی اٹھارہویں آیت (اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَکَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْہِ الْعَذَابُ وَمَنْ یُّہِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّکْرِمٍ اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ) میں سے "اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ ...... وَالشَّجَرُ" کے الفاظ کی تفسیر ملتی ہے۔

(ج) پچھترویں آیت (اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ) میں سے "اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ ..... وَمِنَ النَّاسِ" کی تفسیر دستیاب ہے۔

یہ اقتباسات شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے "اخبار الاخیار" میں شیخ عبدالوہاب بخاری کے حالاتِ زندگی درج کرکے نقل کردیے ہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق اس وقت "تفسیر القرآن" کے دستیاب اقتباسات کا واحد ذریعہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی

یہی تالیف ہے۔

مذکورہ بالا اقتباسات میں مولف مختلف آیات سے خاطر خواہ تاویلات کرتے ہوئے "یحتمل ان یکون" (اس بات کا احتمال ہے) "یمکن" (ہوسکتا ہے) اور "یمکن ان یکون" (اس بات کا امکان ہے) کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور کہیں کہیں یہ الفاظ استعمال کئے بغیر بھی اپنی تاویلات رقم کردیتے ہیں۔ وہ ہر آیت کی تفسیر کا آغاز "اعلم" یا "اعلم یا ھذا" سے کرتے ہیں۔ "اعلم یا ھذا" کی ترکیب ان کی تفسیر میں کثرت سے آئی ہے۔ مولف نے ان آیات کی تفسیر میں کہیں بھی اپنا یا کسی اور شاعر کا کوئی نعتیہ یا دیگر اصناف سخن سے متعلق کوئی شعر درج نہیں کیا، حالانکہ وہ خود نعت گو شاعر تھے اور رسول کریمؐ کے فضائل و مناقب میں انہوں نے عربی میں قصائد لکھے ہیں۔ وہ "تفسیر القرآن" میں رسول کریمؐ کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کرتے ہیں۔ جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول پاکؐ کو خطاب ہوتا ہے ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے وہ "یا محمد" "خوب صورۃ" اور "یا احمد" "خوب روی" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جیسے "وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ مَرْیَمَ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"واذکر یا محمد" "خوب صورۃ" "ویا احمد" "خوب روی" فی کتابک۔"

اسی طرح سورہ حج کی آیت "اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"فقال اللہ یا محمد" "خوب روی"۔"

ہوسکتا ہے وہ محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے پیار اور ان کی خوب صورتی کے اظہار کے لئے "خوب صورۃ" اور "خوب رو" جیسے فارسی الفاظ کا فصیح تحریری عربی میں

استعمال درست سمجھتے ہوں اور انہیں دخیل گردانتے ہوں۔ اسی والہانہ پن کا اظہار خصوصیت
کے ساتھ اس وقت بھی کرتے ہیں جب وہ دیگر انبیائے کرام کے خصائص و فضائل میں
وارد شدہ صریح آیات کی تفسیر کرتے ہوئے ان فضائل و مناقب کو بھی محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کی ذات سے وابستہ کردیتے ہیں اور ایسی تاویلات کے بعد "ھذا الوجہ الذی من
الحلو عند ارباب الحب" (یہ توجیہ ارباب عشق و اہل محبت کے نزدیک شیرینی سے
بھی شیریں تر ہے) اور اسی طرح "ھذا الذی من الحلو و اللبن المخلوط بالارز
والسکر المصری" (یہ توجیہ شیرینی سے زیادہ شیریں اور شیر و شکر سے زیادہ لذیذ ہے)
کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

سارے کے سارے قرآن مجید سے رسول پاکؐ کی مدحت و نعت کے اثبات کی کوشش
بڑی عجیب و غریب اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت منفرد ہے۔ سید مناظر احسن گیلانی
لکھتے ہیں:

"میں سمجھتا ہوں کہ عوام میں ان کے اس کام نے بڑی اہمیت حاصل کی ہوگی کہ
سارا قرآن مجید پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت ہے، عام مسلمانوں کے لئے بظاہر بڑا
دلکش فقرہ ہے۔"

"تفسیر القرآن" کے دستیاب اقتباسات کے مطالعہ کے بعد یہی کچھ کہا جاسکتا ہے
کہ اس تفسیر کی تمام تر اہمیت اس کے مضامین و مشتملات کی ندرت کی بنا پر ہے ورنہ
اس کے مباحث علمی و فنی حیثیت سے محل نظر ہیں۔ قرآن کریم کے آغاز سے اختتام تک
تمام قرآنی آیات میں سے ہر ایک آیت سے حضور سید المرسلین کی فضیلت و منقبت
پر اصرار اور انہی مضامین کی تکرار کے لحاظ سے یہ تفسیر مسلمانوں کے پورے تفسیری

سرمائے میں عدیم النظیر ہے۔

چند اقتباسات چونکہ یہ مقالہ اردو میں ہے، اس لئے اردو خواں حضرات کی سہولت
کے لئے "تفسیر القرآن" کے چند اقتباسات بطور نمونہ اردو ترجمہ کے ساتھ درج کئے
جارہے ہیں۔ یہ ترجمہ مقالہ نگار نے کیا ہے۔ "تفسیر القرآن" کے ایسے مقامات جہاں مؤلف
سے اپنی مجذوبیت کی وجہ سے شطحیات کا صدور ہوا ہے، ہم نے نہ تو ان مقامات و شطحیات
کا اقتباس نقل کیا ہے اور نہ ہی ان کا ترجمہ کرنے کی جسارت کی ہے۔

سورۃ مریم

کٓھٰیٰعٓصٓ (۱) اعلم یا حبیب	اے محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم
حبیب الرحمٰن صلی اللہ علیہ	سے محبت رکھنے والے انسان! اس
وسلم ان الحروف المقطعۃ	بات کو جان لے کہ حروف مقطعات
من خزائن اللہ العظیم	خداوند بزرگ کے ان خزانوں میں
التی قد سلمت الی النبی	سے ہیں جو پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم
العظیم و عندہ مفاتح	کے سپرد کئے گئے ہیں اور آپؐ کے پاس
الغیب لا یعلمہا الا ھو	غیب کی کنجیاں ہیں جنھیں آپؐ کے
وقال علی بن ابی طالب کرم	علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ حضرت علی
اللہ وجہہ: ھذا اسم	کرم اللہ وجہہ کا فرمان ہے کہ یہ حروف
اللہ الاعظم جل جلالہ	اللہ جل شانہ کا اسم اعظم ہیں۔
واعلم یا ھذا یحتمل ان	اے مخاطب! یہ جان لے کہ اس بات
یکون الکاف اشارۃ الی	کا بھی احتمال ہے کہ کھیعص کے

کن والھاء والیاء اشارۃ الی
لفظ ھیا للنداء والعین اشارۃ
الی عین العبد وھو محمد
سید المرسلین صلی اللہ علیہ
وسلم والصاد الی صورۃ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم والمعنی بھذا التاویل
کن ھیا عبد اللہ صورۃ
تتجمل بجمال اللہ فینتفع
الناس بك ویکون ھذا
الخطاب لسید المرسلین لیصیر
صورۃ فی رحم امہ بعد
ما کان روحا ونورا عند اللہ
بنعمتہ کانت عند اللہ
جل جلالہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

مجموعۂ حروف میں سے) حرف کاف
لفظ "کن" کی طرف اشارہ ہو حرف
ھاء اور حرف یاء لفظ "ھیا" کی
طرف اشارہ ہو جو ندا کے لئے بولا
جاتا ہے اور حرف عین، عین العبد
(خصوصی اور حقیقی بندے) کی طرف
اشارہ ہو اور وہ خود سردار انبیاء
کی ذات ہے اور حرف صاد رسول اللہ
کی صورت کی طرف اشارہ ہو۔ اس
تاویل سے (کھیعص) کے معنی
یہ ہوں گے کہ اے عبد خدا صلی اللہ
علیہ وسلم! آپ جمال الٰہی سے آراستگی
حاصل کرتے ہوئے اس طرح صورت
پذیر ہو جائیے کہ لوگ آپ کی ذات سے
استفادہ کریں۔ سردار انبیاء صلی اللہ
علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کا یہ خطاب
اس لئے ہوگا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے
ہاں ایک عرصہ تک روح و نور کی
حالت میں رہنے کے بعد اس کی مہربانی

سے اپنی والدہ ماجدہ کے رحم مبارک
میں صورت پذیر ہو جائیں۔

إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ نِدَاءً
خَفِيًّا (۳) یمکن ھذا النداء
زکریا الخفیۃ استشفاعۃ
بسید المرسلین صلی اللہ
علیہ وسلم وھو الذی
توجہ الیہ جمیع الانبیاء
علیھم السلام فی امورھم
وحوائجھم وھو الامام
المشھور فیما بینھم
صلی اللہ علیہ وسلم

(جب حضرت زکریا علیہ السلام نے
اپنے پروردگار کو پوشیدہ طور پر پکارا)
ہو سکتا ہے کہ حضرت زکریا کی یہ ندا
جو انہوں نے پوشیدہ طور پر اللہ تعالیٰ
سے کی (ان کی) ندا پروردگار عالم سے
حضور سید المرسلین کی شفاعت طلبی
کے لئے ہو کیونکہ آپ ہی وہ ذات ہیں
کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام
اپنے امور وضروریات کے وقت آپ
کی طرف متوجہ ہوئے اور آپ معشر انبیاء
میں "الامام" کے لقب سے مشہور ہیں۔

إِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِن
وَرَائِي ....(۵) ویمکن
یا ھذا ان یکون خوف زکریا
الموالی بان یتغیر وفی الانتظام
لسیدنا وذلك لان الانبیاء
کلھم کانوا منتظرین لبعثہ

(اور یقیناً میں اپنے پیچھے اپنے رشتہ داروں
اور بھائی بندوں سے ڈرتا ہوں۔)
اے مخاطب! ہو سکتا ہے کہ حضرت
زکریا کو اپنے وارثوں (قرابت داروں
اور بھائی بندوں) سے اس بات کا اندیشہ
ہو کہ کہیں وہ سیدنا حضور کریم صلی اللہ

یوصون اممهم بانتظاره کی ینتفعوا به صلی اللہ علیه وسلم۔

علیہ وسلم (کی آمد آمد کا) انتظار کرتے کرتے بدل نہ جائیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام (اپنے اپنے زمانہ نبوت میں) آپؐ کی بعثت کے منتظر رہے اور اپنی اپنی امتوں کو آپؐ کی بعثت کا منتظر رہنے کی وصیت کرتے رہے تاکہ وہ آپؐ سے فائدہ و نفع حاصل کریں۔

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا (۶۲)

لایسمعون فیها لغوا الا سلما یمکن ان یکون السلام منهم علی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ومنه علیهم۔ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا۔ یمکن ان یکون الرزق هو الصحبة مع سید المرسلین صلی اللہ علیه وسلم افضل الرزق۔

[(اہل جنت) اس میں بیہودہ باتیں نہیں سنیں گے (وہ صرف سلام سنیں گے) اور انہیں اس میں صبح و شام ان کا رزق ملے گا] یہاں (سلاماً) سے یہ مراد لی جاسکتی ہے کہ (جنت میں) اہل جنت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو السلام علیکم کہیں گے اور آپؐ اہل جنت کو۔ ہوسکتا ہے کہ اس رزق سے مراد حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و ہم نشینی ہو کیونکہ آپ کی صحبت و ہم نشینی سب سے اچھا رزق ہے۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا (۶۳) یحتمل ان یکون من کان تقیا هو رسول اللہ ای نورث تلك الجنة محمدا صلی اللہ علیه وسلم فیعطی من یشاء وهو السلطان فی الدنیا والآخرة فله الدنیا وله الجنة وله المشاهدات صلی اللہ علیه وسلم۔

(یہی وہ جنت ہے جس کا ہم اپنے بندوں میں سے ایسے شخص کو وارث بنائیں گے جو پرہیزگار ہوگا) اس بات کا احتمال ہے کہ "من کان تقیا" سے مراد رسول اللہؐ ہوں یعنی ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت کا مالک بنا دیا۔ پس آپؐ جس کو چاہیں جنت عطا فرمائیں اور جس سے چاہیں روک لیں آپ دنیا و آخرت کے بادشاہ ہیں۔ (کیونکہ) دنیا، جنت اور مشاہدات (سب کچھ) آپ ہی کا حق ہے۔

سورۃ طٰہٰ

فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ يَا مُوسَىٰ إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ..... (۱۲) اعلم یا هذا ان الکلیم لما جاء نودی بکلام السلاطین وامر باداب المتوجهین الی الملوك فقیل انی انا ربك فاخلع نعلیك

[پس جب (حضرت موسیٰ آگ کے پاس) آئے (تو انہیں بارگاہ خداوندی سے) آواز دی گئی کہ اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں پس اپنے جوتے اتار ڈالو] اے مخاطب! اس بات کو جان لے کہ جب (حضرت موسیٰ) کلیم آئے (تو انہیں بارگاہ خداوندی سے) بادشاہوں

فقوله: "انی انا ربك" اظهار
السلطنة وقوله: "فاخلع
نعليك" امر برعاية الادب
عند التوجه الى السلطان
والحبيب الشهيد الناظر
الى وجه السلطان بعين
الراس نودى بقوله تعالىٰ
"السلام عليك ايها النبى
ورحمة الله وبركاته" فكان
الخطاب بين الكليم والكريم
باظهار السلطنة وكان
بين الحبيب والمحبوب
باظهار المؤانسة والملاطفة
فشتان بين الخطابين
ياهذا افافهم ان الكليم
كان غائبا والسلام على
الحاضرين والحبيب كان حاضرا
والسلام للحاضرين والكلام
باظهار السلطان للطالبين

کے انداز کلام کے ساتھ آواز دی گئی
اور (انہیں) شہنشاہوں کے دربار
میں حاضری دینے والوں کے رسوم
و آداب ملحوظ رکھنے کا حکم دیا گیا اور
انہیں کہا گیا "انی انا ربک فاخلع
نعلیک" (میں تیرا پروردگار ہوں
پس اپنے جوتے اتار ڈالئے) پس قول
الٰہی "انا ربک" میں سلطنت (قوت
حاکمہ اور قدرت مقتدرہ) کا اظہار
ہے اور قول الٰہی "فاخلع نعلیک"
میں بادشاہ کی طرف آتے ہوئے
(حاضر ہوکے) آداب بجالانے کا حکم ہے
جب کہ حاکم مقتدر کے رخ انور پر
اپنی حقیقی آنکھوں سے نظر ڈالنے
والے حبیب لبیب صلی اللہ علیہ وسلم
جب آئے تو آپ کو "السلام علیک
ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"
(اے نبی آپ پر سلام اور اللہ کی رحمت
اور برکتیں ہوں) کے الفاظ کے ساتھ

والسلام على المطلوبين
فالكليم كان طالبا ونعم الطالب
المولى والحبيب كان مطلوبا
قد طلب بالبراق واوقظ
من النوم بلا وعد سابق۔

آواز دی گئی۔ پس موسیٰ (کلیم) اور
رب کریم کے درمیان ہونے والی بات
چیت میں سطوت اور جاہ وجلال
کا اظہار مقصود تھا حبیب اور محبوب
(خدا اور رسول) کے درمیان ہونے
والی بات چیت میں انس ومحبت اور
لطف ومدارات کا اظہار مطلوب
تھا سو حضرت کلیم اور محو کریم سے
کئے جانے والے خطاب میں کس قدر
نمایاں فرق موجود ہے۔

اے مخاطب! اس بات کو جان لے کہ
کلیم غائب تھے اور سلام حاضرین پر تھا
اور حبیب صلی اللہ علیہ وسلم موجود
تھے اور سلام بھی موجودین پر تھا۔
طالبین کے لئے خطاب جاہ وجلال
کے اظہار کے ساتھ تھا کیوں کہ حضرت
کلیم طالب تھے اور کتنا اچھا ہے وہ
شخص جو مالک حقیقی کا طالب گار ہو
جب کہ حبیب مطلوب تھے اور انہیں

کسی گزشتہ وعدے کے بغیر نیند سے
بیدار کر کے ”براق“ پر سوار کر کے بلایا گیا۔

سورۃ الانبیاء

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا
لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ
اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ (۱۷) اعلم
یا ھذا ان فیما اسرار اللہ
لا یعلمھا الا ھو والرسول
ویحتمل ان یکون المراد
من المتخذ من لدن رب
العالمین ھو الحبیب صلی اللہ
علیہ وسلم ای لو اردنا ان
نتخذ ولداً کما زعمت
النصاریٰ لا تخذناہ من
لدنا بان نتخذ محمداً
ولداً حین کان لدینا نوراً
قبل جمیع الکائنات وھو
بشر لیس کمثلہ احد من
البشر لا ان نتخذ عیسیٰ الذی

[اگر ہم چاہتے کہ (اس کائنات کو)
کھیل تماشا بنائیں تو ہم اپنے پاس
سے بنا لیتے اگر ہم ایسا کرنے والے ہوتے]
اے مخاطب! یہ جان لے کہ اس آیت
میں اسرار الٰہی ہیں جن کو اللہ اور اس کے
رسولؐ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور
اس بات کا بھی احتمال ہے کہ المتخذ
من رب العالمین“ سے مراد
حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتؐ
یعنی اگر ہم نے ارادہ کیا ہوتا کہ ہم (کسی کو)
بیٹا بنالیں جیسا کہ نصاریٰ کا گمان ہے
کہ ہم نے (عیسیٰ) کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے
تو ہم حضرت محمدؐ کو (اس وقت) بیٹا بنا
لیتے جب آپ تمام کائنات کی تخلیق
سے پہلے ہمارے پاس نور کی صورت
میں موجود تھے (کیونکہ) آپ ایسے

ھو من اتباع محمد ولداً
ولکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ
منزہ عما یقول الظالمون
فمحمد عبدہ ورسول
وعیسیٰ عبدہ ورسولہ۔

(ارفع واعلیٰ اور احسن وافضل)
بشر ہیں کہ عالم بشریت میں آپ جیسا
کوئی اور بشر نہیں۔ (ہم اگر بیٹا بنا
ہوتا تو آپ کو بیٹا بناتے نہ کہ حضرت
عیسیٰ کو جو کہ آپ کے متبعین میں سے
ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اس بات سے بالا
واعلیٰ اور پاک وصاف ہے جو کہ مشرک
لوگ کہتے ہیں کیونکہ حضرت محمد اللہ کے
بندے اور رسول ہیں اور حضرت عیسیٰ
بھی اسی کے بندے اور رسول ہیں۔

سورۃ الحج

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ
مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ
بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ
لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ
وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (۲۶)
اعلم یا ھذا ان المقصود
من البیت طینۃ سید
المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

[اور جب ہم نے ابراہیم کے لئے خانہ
کعبہ کی جگہ مقرر و متعین کر دی اور
انہیں کہا کہ) میرے ساتھ کسی چیز کو
شریک نہ ٹھہرانا اور میرے گھر کو طواف
کرنے والوں، قیام کرنے والوں، رکوع
کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے
لئے پاک رکھنا] اے مخاطب! اس
بات کو جان لے کہ ”البیت“ سے مراد

فیما شرفت الکعبۃ وسمیت ببیت اللّٰہ تعالیٰ واللّٰہ اعلم والتطہر ایضا کان لتربۃ السید علیہ السلام وفیما اسرار اللّٰہ لایعلمہ الااللّٰہ ورسولہ جل جلالہ وصلی اللّٰہ علیہ وسلم۔

حضور سید المرسلین صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی طینت (آب و گل کا وہ خمیر جس سے آپؐ کے وجود اطہر کی تشکیل ہوئی) ہے اسی سے کعبہ کو شرف بخشا گیا اور اس کا نام بیت اللّٰہ رکھا گیا اور اللّٰہ سب سے زیادہ علم والا ہے۔ اس آیت میں اسرار خداوندی ہیں جن کو اللّٰہ اور اس کے رسول کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

حوالہ و حواشی جات

[1] دہلوی، شیخ عبدالحق محدث، اخبار الاخیار فی اسرار الابرار، دہلی مطبع مجتبائی، ۱۳۳۲ھ ص ۲۱۵ [2] الحسنی، عبدالحی، نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر، ملتان، طیب اکادمی ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۱ء جلد ۴ ص ۱۹۸ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] گیلانی، مولانا مناظر احسن، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، حیدرآباد دکن، مطبع النظامی، سن طباعت ندارد، جلد ۲، ص ۳۰۹ [6] حسنی عبدالحی حوالہ مذکورہ بالا، ج ۴ ص ۱۹۹ [7] ایضاً [8] ایضاً [9] دہلوی، شیخ عبدالحق محدث، حوالہ مذکورہ بالا ص ۲۱۵ [10] حسنی عبدالحی، حوالہ مذکورہ بالا، جلد ۴ ص ۱۹۹ [11] دہلوی شیخ عبدالحق محدث حوالہ مذکورہ بالا ص ۲۱۵ [12] مانڈوی، محمد غوثی شطاری، گلزار ابرار، مترجمہ فضل احمد جیوری لاہور، اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۵ء، ص ۲۳۰ [13] گیلانی مولانا مناظر احسن، حوالہ مذکورہ بالا ج ۲ ص ۳۰۹ [14] حسنی عبدالحی، حوالہ مذکورہ بالا ج ۴، ص ۱۹۹ [15] دہلوی شیخ عبدالحق محدث حوالہ مذکورہ بالا ص ۲۱۵ [16] حسنی عبدالحی حوالہ مذکورہ بالا ج ۴ ص ۱۹۹ [17] گیلانی مولانا مناظر

احسن حوالہ مذکورہ بالا، ج ۲ ص ۳۱۰ [18] مانڈوی، محمد غوثی شطاری، حوالہ مذکورہ بالا ص ۲۳۰ [19] دہلوی، شیخ عبدالحق محدث، حوالہ مذکورہ بالا ص ۲۱۵ [20] حسنی عبدالحی حوالہ مذکورہ بالا ج ۴ ص ۱۹۹ [21] البغدادی، اسمٰعیل پاشا، ہدیۃ العارفین، بیروت، دار الکتب العلمیۃ ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۲ء ص ۶۴۰ [22] کحالہ، عمر رضا، معجم المولفین بیروت، دار احیاء التراث، سن طباعت مذکور نہیں، ج ۶ ص ۲۱۷ [23] عادل نویہض، معجم المفسرین، بیروت، موسستہ نویہض الثقافیہ ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء ج ۱ ص ۳۴۷ [24] حسنی عبدالحی حوالہ مذکورہ بالا ج ۴ ص ۳۰۰ [25] عادل نویہض، حوالہ مذکورہ بالا ج ۱ ص ۳۴۷ [26] دہلوی شیخ عبدالحق محدث، حوالہ مذکورہ بالا ص ۲۱۵ [27] دہلوی شیخ عبدالعزیز، ملفوظات شاہ عبدالعزیز متھرا، مطبع مجتبائی ۱۳۱۴ھ ص ۸۵ [28] مانڈوی، محمد غوثی شطاری، حوالہ مذکورہ بالا ص ۲۳۰ [29] حسنی عبدالحی، حوالہ مذکورہ بالا ج ۴ ص ۳۰۰ [30] ایضاً [31] السیوطی، امام جلال الدین عبدالرحمٰن، الاتقان فی علوم القرآن تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، منشورات رضی (ایران) ۱۳۸۹ھ۔ ش ج ۲ (الجزء الرابع) ص ۲۳۲ [32] ایضاً [33] دہلوی، شیخ عبدالحق محدث، حوالہ مذکورہ بالا ص ۲۱۵ [34] دہلوی شاہ عبدالعزیز، حوالہ مذکورہ بالا، ص ۸۵ [35] حسنی، عبدالحی، حوالہ مذکورہ بالا، ج ۴ ص ۱۹۹ [36] گیلانی مولانا مناظر احسن، حوالہ مذکورہ بالا ج ۲ ص ۳۱۰ [37] دہلوی، شیخ عبدالحق محدث، حوالہ مذکورہ بالا ص ۲۱۴ [38] وہ خلاف شریعت الفاظ و کلمات جو سکر و مستی اور جذب و ذوق کے عالم میں غیر اختیاری طور پر صوفیاء کے زبان سے صادر ہوں شطحیات کہلاتے ہیں۔ شطح اور شطحیات کے بارے میں مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: i- ابن عربی، کتاب اصطلاح الصوفیہ حیدرآباد دکن، ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء۔ بذیل مادہ ص ۳۔ ii- ابن خلدون، المقدمۃ، موسستہ الاعلمی، بیروت، سن طباعت ندارد، بذیل علم التصوف، ص ۴۷۵-۴۷۶۔ iii- شریف جرجانی، کتاب التعریفات، تحقیق ڈاکٹر عبدالرحمٰن عمرہ، عالم الکتب، بیروت، ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۶ء بذیل مادہ، ص ۱۶۶-۱۶۷۔ iv- محمد اعلیٰ التھانوی، کشاف اصطلاحات الفنون، سہیل اکیڈمی، لاہور، ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۳ء ج ۱، ص ۷۳۵۔ v- محمد غادی عرابی، النصوص فی علم التصوف، دار قتیبہ، دمشق ۱۹۸۵ء بذیل مادہ، ص ۱۷۵۔

فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے معاصرین

از

جناب فیروز الدین احمد فریدی*

پاک پتن میں ، فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے مزار کے سرہانے ، موجودہ دیوان کی جانب سے ، بہت اہتمام سے ایک تختی نصب کی گئی ہے جس پر سات سو سالہ پرانی کتاب ''سیرالاولیاء'' کے حوالے سے فریدالدین مسعودؒ کی تاریخ وفات ۵ محرم ۶۶۴ھ تحریر ہے ، ۵ محرم کے تاریخِ وفات ہونے کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کیوں کہ اس تاریخ کا ثبوت فریدالدین مسعودؒ کے خلیفہ اور سب سے چہیتے مرید خواجہ نظام الدین اولیاء کا مستند فرمودہ ہے ، لیکن مستند تاریخی شواہد کی روشنی میں ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) کا سالِ وفات ہونا درست نہیں۔

تاریخی شواہد کی روشنی میں فریدالدین مسعودؒ کا سالِ وفات ۶۶۸ھ یا ۶۷۰ھ ہے ۔ یہ تاریخی شواہد کیا ہیں ؟ یہ مضمون ان کا متحمل نہیں ہوسکتا ، ان کے بارے میں ''فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کا سال وفات'' کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ برِ صغیر کے مشہور اور قدیم دینی ، تحقیقی اور علمی رسالہ ''معارف'' میں قسط وار ، دسمبر ۲۰۰۱ء سے شائع ہورہا ہے ۔

* کھتوال ہاؤس ۵۴-اے، سٹریٹ ۱۵، باتھ آئی لینڈ، کراچی، ۷۵۵۳۰ - پاکستان -

فریدالدین مسعودؒ کے عقیدت مند اس مضمون کو پڑھنے کے بعد اس صدیوں پرانے مسئلے پر غور وفکر کریں اور اکیسویں صدی عیسوی میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچیں اگر فریدالدین مسعودؒ کا سال وفات (۵ محرم) ۶۶۸ھ ہے تو عیسوی تقویم کے مطابق آپ کی تاریخ وفات چار ستمبر ۱۲۶۹ء بروز بدھ پڑتی ہے ۔ اگر سال وفات (۵ محرم) ۶۷۰ھ ہے تو تاریخ وفات تیرہ اگست ۱۲۷۱ء بروز جمعرات ہوگی۔

فریدالدین مسعودؒ ۱۱۸۰ء اور ۱۲۷۱ء کے درمیان تقریباً ۹۰ برس جئے ۔ ۹۰ برس کا یہ دور تاریخ عالم میں قرونِ وسطیٰ کے نام سے جانا جاتا ہے ۔ یہ ایک عجیب دور تھا ، ایک طرف مسلمانوں کی دنیاوی حکومت ان پستیوں میں گری جن کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی ، دوسری طرف اسلامی تصوف نے عروج کی ان بلندیوں کو چھوا جن کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی ۔ اور جس کا اندازہ درج ذیل حقایق سے ہوجائے گا۔

یہ وہ دور تھا جب بغداد میں صدیوں سے قائم خلافتِ عباسیہ اور قرطبہ میں صدیوں سے قائم خلافتِ امویہ کا خاتمہ ہوا یہی وہ دور تھا جب چنگیز خاں ۱۱۶۲ء کے لگ بھگ منگولیا میں پیدا ہوا ، بابا صاحب اس کے کوئی اٹھارہ برس بعد ملتان کے مضافات میں ایک قصبے ''کوٹھے والی'' یا ''کھتوال'' میں پیدا ہوئے ، ۱۲۲۷ء میں جب چنگیز خاں مرا تو باباصاحب ۴۶ ، ۴۷ سال کے تھے ، یہی وہ دور تھا جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۹۳ء میں وفات پائی ، باباصاحب اس وقت ۱۲ برس کے لڑکے تھے ۔ یہی وہ دور تھا ، جب ۱۵ جون ۱۲۱۵ء کو شاہ انگلستان ''جان'' نے ''میکنا کارٹا'' پر دستخط کیے جو عوام کے حقوق کے بین الاقوامی چارٹر کے طور پر آج تک مشہور ہے ، جب انگلستان میں ''رنی میڈ'' کے مقام پر اس عالمی شہرت پانے والی دستاویز پر دستخط ہورہے تھے تو بابا صاحب کی عمر

۳۴، ۳۵ برس تھی، اس وقت پاپائے روم ''انوسنٹ III'' تھا کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ شاہِ انگلستان ''جان'' کی اپیل پر اس مشہور و معروف پوپ نے میگنا کارٹا کو منسوخ کردیا تھا، ۱۲۳۶ء میں جب اسپین میں مسلم حکومت کے دارالسلطنت قرطبہ سے مسلمانوں کی حکومت ہمیشہ کے لئے ختم ہوئی، اس وقت بابا صاحب تقریباً ۵۵ برس کے تھے، بائیس برس بعد، ۱۲۵۸ء میں جب ہلاکو نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو بابا صاحب اسّی برس کے پیٹے میں تھے۔

بغداد اور قرطبہ صرف مسلم حکومتوں کے دارالخلافے نہ تھے بلکہ مشرق اور مغرب میں نہ صرف مسلم تہذیب و تمدن بلکہ بین الاقوامی علوم اور فنون کے مراکز تھے، تاریخ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ایک طرف مشرق اور مغرب میں عقل اور علم کے یہ قدیم مراکز اجڑ رہے تھے اور ادھر اسی دور میں ۱۲۴۹ء میں مغرب میں آکسفورڈ کے مقام پر وہاں کا پہلا کالج ''یونیورسٹی کالج آکسفورڈ'' کے نام سے قائم ہو رہا تھا اور ادھر مشرق میں بابا صاحب تقریباً ستر برس کی عمر میں پاک پتن میں جو اس زمانے میں اجودھن کہلاتا تھا، عقل، علم اور عشق کے اس بین الاقوامی مرکز کی بنیاد رکھ رہے تھے جو بابا صاحب کا جماعت خانہ کہلاتا تھا، یہی وہ دور تھا جب ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے یروشلم فتح کیا جو تقریباً اگلی آٹھ صدی تک یعنی ۱۹۶۷ء تک مسلمانوں کے پاس رہا، یہی وہ دور تھا جس میں ۱۱۸۹ء میں تیسری صلیبی جنگ کا آغاز ہوا جس میں انگلستان کا بادشاہ رچرڈ شیر دل شریک تھا، اور سب سے آخر میں یہ بات کہ یہی وہ دور تھا جب سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ۱۱۹۳ء میں ترائن کے مقام پر، اجمیر اور دلی کے راجہ پرتھوی راج کو شکست دے کر دلی پر قبضہ کرلیا، ۱۱۹۳ء ہی وہ سال تھا جب

صلاح الدین ایوبی کا انتقال ہوا، ترائن کی جنگ اور صلاح الدین ایوبی کے انتقال کے وقت بابا صاحب بارہ تیرہ برس کے لڑکے تھے، ۱۲۰۶ء میں شہاب الدین محمد غوری کے غلام اور جنرل قطب الدین ایبک نے سلطنت دہلی کی بنیاد رکھی، قطب الدین ایبک کے بعد خاندانِ غلاماں کے مشہور سلاطین دہلی میں التمش، رضیہ سلطانہ، ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن کے نام آتے ہیں، بلبن ۱۲۶۶ء (مطابق گیارہ جمادی الاولیٰ ۶۶۴ھ) کو سلطان دہلی بنا۔ بابا صاحب اس وقت حیات تھے اور اسی وجہ سے ۵ محرم ۶۶۴ھ ان کی تاریخ وفات نہیں ہوسکتی، بابا صاحب نے بلبن کے ابتدائی دورِ سلطانی میں ۶ ستمبر ۱۲۶۹ء یا ۱۳؍ اگست ۱۲۷۱ء (۵ محرم ۶۶۸ھ یا ۵ محرم ۶۷۰ھ) کو تقریباً نوے برس کی عمر میں وفات پائی۔

اسی عہد کا مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی اپنی مشہور کتاب ''تاریخ فیروز شاہی'' میں لکھتا ہے:

''یہ عہد ایسے مشائخ کی موجودگی سے مزین اور مشرف تھا کہ ان جیسی ہستی مدت میں پیدا ہوتی ہے، مثلاً اس (یعنی بلبن) کے عہد کے ابتدائی دور میں شیخ شیوخ العالم فریدالدین مسعود بہ قید حیات تھے، وہ قطبِ عالم اور مدارِ جہاں تھے، اس خطۂ زمین کے لوگوں کو انہوں نے اپنی پناہ اور اپنے سائے میں لے رکھا تھا...... ان کے قرب اور برکتِ انفاس کی وجہ سے لوگ دین و دنیا کی مصیبتوں سے نجات پاتے تھے اور جو اس کے اہل تھے (وہ) ان کی ارادت کے ذریعے بلند مراتب حاصل کرتے تھے''۔

ضیاء الدین برنی کے یہ جملے پڑھ کر ہماری نظر بے ساختہ زمین سے اٹھ کر

تصوف کے آسمان پر پڑتی ہے، تاریخ گواہ ہے کہ آسمان تصوف پر اتنے روشن ستارے نہ کبھی پہلے ایسی آب وتاب سے چمکتے دمکتے اور جگمگاتے نظر آئے اور نہ بعد میں۔ یوں کہہ لیجئے کہ جیسے بعض زمینیں زرخیز ہوتی ہیں، ویسے ہی جیسے بعض زمانے مردم خیز ہوتے ہیں، یہ دور بھی ایک انتہائی مردم خیز دور تھا، بابا صاحب کے تیرہ (۱۳) مشہور ہم عصر صوفیہ کے نام یہ ہیں:

(۱) محی الدین ابن عربی (۲) جلال الدین رومی (۳) شیخ سعدی (۴) شہاب الدین سہروردی (۵) لال شہباز قلندر (سہون سندھ) (۶) بہاء الدین زکریا (ملتان) (۷) جلال الدین بخاری (اُوچ) (۸) معین الدین چشتی (۹) قطب الدین بختیار کاکی (۱۰) نظام الدین اولیاء (۱۱) علاء الدین صابر (کلیر) (۱۲) فریدالدین عطار (۱۳) ابوالحسن علی الشاذلی۔

اس دور کے چودھویں عظیم صوفی عبدالقادر جیلانی ہیں جن کا نام بزم صوفیہ کی اس فہرست میں صرف اس لئے شامل نہیں کیا گیا کہ ان کا انتقال بابا صاحب کی ولادت سے تیرہ چودہ برس پہلے ہوگیا تھا۔

غور کیجئے کہ اسلامی تصوف کے عظیم سلسلوں میں سے دو سلسلوں یعنی ''قادریہ'' اور ''شاذلیہ'' سلسلوں کے بانی یعنی شیخ عبدالقادر جیلانی اور شیخ ابوالحسن علی الشاذلی اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں، دو عظیم سلسلوں یعنی چشتیہ اور سہروردیہ کے مشہور ترین صوفیہ یعنی خواجہ معین الدین چشتی اور شیخ شہاب الدین سہروردی بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں، برِ صغیر پاک و ہند سے باہر ابن عربی، جلال الدین رومی، شیخ سعدی اور فریدالدین عطار جیسے شہرۂ آفاق نام اور برِ صغیر میں سہون کے

لال شہباز قلندر، ملتان کے بہاء الدین زکریا، اُوچ کے جلال الدین بخاری اور سلسلۂ چشت کے قطب الدین بختیار، نظام الدین اولیاء اور علاء الدین صابر سب اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایسا دور اسلامی تاریخ میں پہلے آیا، نہ بعد میں، دنیا کی بادشاہتوں کی بربادی کا یہ دور دین کے شہنشاہوں کی تاجداری کا دور تھا، بعض لوگ، بلکہ شاید اکثر لوگ اسے اتفاقات زمانہ سے تعبیر کریں گے، بعض اسے غالباً اتفاق زمانہ سے تعبیر نہیں کریں گے۔

۱۹۷۳ء میں ہندوستانیوں نے وہ کیا جس کی توفیق پاکستانیوں کو آج تک نہ ہوسکی، نومبر ۱۹۷۳ء میں بابا فرید میموریل سوسائٹی پٹیالہ نے بابا صاحب کا آٹھ سو سالہ جشن ولادت دلی، اجمیر اور لکھنؤ میں بڑی دھوم دھام سے منایا جس میں جمہوریہ ہند کے صدر سے لے کر بھارت کے چوٹی کے وزراء، سیاسی رہنما اور سرکاری عہدے دار سب ہی شریک ہوئے، اس موقع پر بابا صاحب کی شان میں پانچ اشعار پر مشتمل ایک مختصر اور دل نشین نظم پڑھنے کا اعزاز ایک سکھ شاعر کے نصیب میں آیا، نظم یہ ہے:

اے فریدالدین بابا اے مرے گنج شکر — عالم الحاد تیرے خوف سے زیر و زبر
تو نے بخشا اک جہاں کو بادۂ عرفاں کا فور — زہد کا، اخلاص کا تسلیم کا، ایماں کا نور
راہ حق سے اور حق سے تھی شناسائی تیری — اس لئے ہوتی ہے ہر دل میں پذیرائی تیری
ٹوٹ سکتا ہے نظامِ انجم و شمس و قمر — اور مٹ سکتے ہیں دنیا سے یہ دشت و بحر و بر
لیکن اے گنج شکر تو زندہ و پائندہ ہے — کل بھی تابندہ رہے گا، آج بھی تابندہ ہے

اس سکھ کا نام تھا: کنور مہندر سنگھ بیدی، اس کا تخلص تھا: سحر۔ یہ نام اور تخلص آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں روشن ہے۔

وفیات

پروفیسر آل احمد سُرور

ضیاءالدین اصلاحی

۹ فروری ۲۰۰۲ء کو اردو کے بزرگ استاذ، اردو تحریک کے معمر قائد، اردو کے سب سے بڑے ادیب و نقاد، اچھے شاعر، نامور اہل قلم، غالب و اقبال کے پایہ شناس اور علی گڑھ اور سرسید احمد خاں کے عاشق و شیدائی پروفیسر آل احمد سرور رحلت فرما گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن اور پوری اردو دنیا کو مغموم، سوگوار اور اداس چھوڑ گئے ع مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے۔

اردو کی اس کس مپرسی کے دور میں اس کے ایک نہایت ممتاز عالم اور دانشور کا اُٹھ جانا حادثۂ جان کاہ اور اردو کا بڑا زیاں اور خسارہ ہے۔

موت و حیات کا سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا، لیکن برسوں کی گردشِ فلک کے بعد سرور صاحب جیسا مایۂ ناز انسان پردۂ خاک سے نکلتا ہے، ان ہی کا شعر ہے ؎

ستارے کتنے یہاں ڈوبتے ابھرتے ہیں
کبھی کبھی ہی نکلتا ہے آفتاب کوئی

ان کا خلا کیسے پُر ہوگا اور اردو زبان، ادب اور تنقید کے نقصان کی تلافی کیسے ہوگی

ع اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

پروفیسر آل احمد سرور ۱۹۱۱ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے، ابتدائی اور ثانوی تعلیم پیلی بھیت اور غازی پور میں حاصل کی، آگرہ سے بی۔ایس۔سی کیا، ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں

داخلہ لیا اور ۱۹۳۴ء میں انگریزی میں ایم۔اے کر کے اسی کے استاد ہو گئے، اردو ان کی محبوب مادری زبان تھی، ۱۹۳۶ء میں اس میں ایم۔اے کر کے انگریزی سے اردو شعبہ میں منتقل ہو گئے اور اسی زبان سے پیمانِ وفا باندھ لیا، چاہتے تو کوئی اعلا سرکاری عہدہ مل جاتا، لیکن انہیں اپنی زبان اور اپنی تہذیب زیادہ عزیز تھی اس لئے سائنس اور انگریزی جیسے سکۂ رائج الوقت کو بھنانے کے بجائے اردو کی گلی کوچے کی خاک چھاننے میں ان کو شاہانہ لطف و لذت ملی ؎

بادشاہی زیں گدائے یافتم
کے گزارم من گدائے کوئے تو

۱۹۴۶ء میں وہ لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر ہو کر آئے، اس وقت لکھنؤ میں شعر و ادب کی نئی بساط بچھ چکی تھی اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اس کے سپہر علم و ادب پر نئے ستارے جلوہ فگن ہو رہے تھے، لیکن طرزِ کہن کے دل دادگان اور "یادگارِ زمانہ لوگ" بھی ابھی تک ضوفشاں تھے اور افقِ ادب پر نمودار ہونے والے نئے شاعروں اور ادیبوں میں بھی ایک رکھ رکھاؤ تھا اور سب کی بزم آرائی کا مرکز "دانش محل" تھا، سرور صاحب دونوں حلقوں میں گھلے ملے رہے۔

ع باما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

مگر جلد ہی مادر علمی کی کشش انہیں پھر علی گڑھ کھینچ لائی اور شعبہ اردو کے سربراہ ہوئے، وظیفہ یاب ہونے کے بعد کشمیر کی دل فریبی اور جاذبیت انہیں اپنی طرف کھینچی اور اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر کے ڈائریکٹر بنائے گئے، ۱۹۹۰ء میں علی گڑھ کے شعبہ اردو میں پروفیسر ایمریٹس ہوئے۔

غرض گھوم پھر کر زندگی کا زیادہ حصہ علی گڑھ میں گزارا، داخلہ لینے کے بعد ہی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی طلبہ یونین کے نائب صدر اور علی گڑھ میگزین کے اڈیٹر مقرر ہوئے، ایس ایس ہال کے پرووسٹ، اسٹاف ایسوسی ایشن اور شعبۂ اردو کے صدر، آرٹ فیکلٹی کے ڈین اور پروفیسر ایمریٹس رہے، ایکزیکیٹو کونسل اور یونی ورسٹی کورٹ کے رکن بھی ہوتے رہے اور اپنے علم، تجربہ اور سوجھ بوجھ

سے یونی ورسٹی کو فائدہ پہنچاتے اور اس کا نام روشن کرتے رہے، علی گڑھ ہی میں مستقل سکونت کے لیے دارالسرور بھی تعمیر کرایا۔ گو ان کا انتقال دہلی میں ہوا تھا مگر ابدی آرام گاہ یہی سرزمین بنی۔

علی گڑھ کی طرح اردو بھی ان کی زندگی کا محور رہی، عمر بھر وہ اسی کے گیسو کو سنوارتے اور تاب دار کرتے رہے، گو تدریسی زندگی کا آغاز انگریزی کی معلمی سے ہوا تھا، لیکن پھر ساری عمر اردو ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہوگئی تھی اور اس کی تدریس پر مامور رہ کر اور اس میں مضامین اور تصنیفات کا انبار لگا کر اس کا وقار و اعتبار فزوں سے فزوں تر کرتے رہے۔

اردو تحریک کی قیادت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ایسے وقت آئی تھی جب ایوانِ حکومت میں اسے ختم کر دینے کی سازشیں ہو رہی تھیں اور تنگ اور متعصب حکمراں اسے مٹا دینے پر متفق ہوگئے تھے، ایسے نازک دور میں اردو کی روحِ مضمحل میں نئی روح پھونکنے کے لیے جو بیسیا نفس اور سرفروش سامنے آئے ان میں آل احمد سرور بھی تھے، انہوں نے انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اردو کے تحفظ و ترقی کے لئے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ اسی زمانے میں بائیس لاکھ دستخطوں کے محضر کے ساتھ ملک کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو یادداشت پیش کی گئی تھی۔

حکومت اردو والوں کو بہلانے اور پھسلانے کے لئے برابر دام بچھا کر اس میں دانے پھینکتی رہی ہے، اردو کے فروغ و ترقی اور اس کی تعلیم کو رائج کرنے کے نام پر وقتاً فوقتاً جو کمیٹیاں قائم ہوئیں ان میں گجرال کمیٹی کا غلغلہ عرصے تک بلند رہا مگر اس کی تجویزیں اور سفارشات سرد خانے میں ڈال دی گئیں، شور ہونے پر جعفری اور سرور کمیٹیاں تشکیل کر کے زبان بندی کی گئی بہر حال سرور صاحب نے اپنا کام بخوبی انجام دیا اور گجرال کمیٹی کی سفارشات کی نشاندہی کر کے ان کا نچوڑ پیش کیا، مگر یہ سب بے سود رہا اور سرور صاحب کی دلیل و حجت بھی متعصب لوگوں کے بگڑے ذہن و نیت کی اصلاح نہ کر سکی۔

سرور صاحب اس امر کو نہایت شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ پرائمری اور ثانوی سطح پر اردو تعلیم کے بغیر اس زبان کا فروغ نہیں ہو سکتا، اردو پڑھنا پڑھانا بند کر کے اس پر جو تیشہ چلایا گیا ہے اسے کند بنانے کے لئے اس کی تعلیم کو رواج دینا ضروری ہے، فرماتے ہیں:

"تعلیمی اور تہذیبی اور قومی نقطہ نظر سے مادری زبان میں ابتدائی تعلیم ایک ایسا پتھر ہے جس کے بغیر ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی ساری عمارت کجی کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے، جب تک زبان کی بنیاد مستحکم نہ ہو ادب کا فروغ ممکن نہیں، اس لئے جب تک اردو زبان کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا کما حقہ انتظام نہیں ہوتا اس وقت تک یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اردو زبان و ادب ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اگر اردو دوستوں کو واقعی اپنی زبان سے محبت ہے تو انہیں بڑے پیمانے پر ایک ایسی مہم چلانی ہوگی جس سے پہلے مرحلے پر اردو میں ابتدائی تعلیم کا انتظام ہو اور دوسرے مرحلے پر ثانوی تعلیم میں سہ لسانی فارمولے کے ذریعے اردو تعلیم کو آگے بڑھایا جا سکے"۔

انجمن کے پلیٹ فارم سے انہوں نے معیاری کتابیں شائع کر کے اردو کے ذخیرے میں جو خطیر اضافہ کیا ہے اس کا کچھ ذکر آگے آئے گا۔

سرور صاحب محنت، مطالعہ اور مسلسل کام کرنے کے عادی تھے، بچپن ہی سے مطالعہ کے شوقین تھے، کم عمری میں اردو کے معیاری رسالے ان کے مطالعہ میں رہتے تھے، ادبی لٹریچر سے زیادہ دلچسپی تھی، اس لئے شروع ہی سے اردو شاعری اور نثر کی کتابوں کو جمع کرنے لگے تھے، بعض مفید اور دلچسپ کتابوں کا بار بار مطالعہ کرتے تھے، مطالعہ کا یہ ذوق تا عمر رہا، پروفیسر، صدر شعبہ، ڈین، یونی ورسٹی کے مختلف اعزازی عہدوں پر فائز، انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری اور اردو ادب کے اڈیٹر ہونے کے بعد ان کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی تھیں، مگر ان مشغولیتوں میں بھی وہ مطالعہ

کے لئے وقت نکال لیتے تھے اور لکھنے کا کام جاری رکھتے تھے، بڑھاپے اور علالت کے زمانے میں بھی مطالعہ کی عادت نہ چھوٹی، جب بینائی کم ہوگئی اور بیماری کی وجہ سے پڑھنے لکھنے میں زحمت ہوتی تھی تو دوسروں سے پڑھوا کر سنتے اور خود لکھنے کے بجائے املا کراتے تھے۔

ضعف و علالت کے زمانے میں ایک دفعہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے کورٹ کے جلسے میں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا "آپ کے ذمہ دار المصنفین کا ایک قرض چلا آرہا ہے، وہ کب ادا کریں گے" فرمایا "مجھے مولانا شبلی کی تنقید نگاری پر اپنی شرط کے مطابق لکھ دینا ہے، یہ قرض ادا کروں گا"، مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب جب ان کے آنے کا پروگرام بنتا تو کوئی مانع پیش آجاتا، اس زمانے کے ان کے خطوط سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مقالہ مکمل کر چکے تھے، میرا ارادہ تھا کہ ان سے مل کر لے لوں گا، مگر علی گڑھ گیا تو کبھی تو خیال ہی نہ آیا اور کبھی آیا تو وہ وہاں موجود نہیں تھے، اگر یہ مقالہ ان کے کاغذات میں موجود ہو تو ان کے وارثین سے درخواست ہے کہ اسے یہاں بھیج دیں۔

سرور صاحب کو علامہ شبلی اور دار المصنفین سے بڑا تعلق تھا، علامہ شبلی کے ادب و انشا اور شاعری کے خاص طور پر معترف تھے، شاہ معین الدین احمد صاحب اور سید صباح الدین صاحب سے بھی روابط تھے، ایک دفعہ وہ اور پروفیسر احتشام حسین مرحوم شبلی کالج کے شعبہ اردو کی دعوت پر اعظم گڈھ تشریف لائے تو دار المصنفین میں قیام کیا۔

ان کا مطالعہ صرف اردو کتابوں تک محدود نہ تھا، فارسی اور انگریزی ادبیات کا مطالعہ بھی وسیع تھا، انگریزی ادب و تنقید کی جو تازہ بہ تازہ کتابیں شائع ہوتی تھیں وہ برابر ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں، ان کی مدد سے وہ مغربی اور عالمی ادب پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، انھوں نے اپنی کتابوں اور مضامین میں بہ کثرت انگریزی کتابوں اور مغربی نقادوں کے حوالے دئے ہیں۔

اردو ادب و تنقید کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کی کتابیں بھی ان کے مطالعہ میں

رہتی تھیں اور جدید ادب کی طرح کلاسیکی لٹریچر پر بھی ان کی نظر گہری تھی، اس طرح مشرقی ادب و تنقید کی روایتوں اور مغربی ادب و تنقید کی خصوصیات اور ادب و تنقید کے نئے رجحانات سے وہ بہ خوبی واقف تھے۔ وہ ادبی مسائل پر برابر غور و خوض کرتے رہتے تھے اور ان پر اپنے دوستوں اور شاگردوں سے تبادلہ خیال بھی کرتے تھے، طلبہ کو اکثر اس کی تاکید کرتے تھے کہ وہ صرف اردو کتابوں کے مطالعہ کو کافی نہ سمجھیں بلکہ ادب و تنقید کے نئے رجحانات اور رویے سے واقف ہونے کے لئے انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کی ادبی و تنقیدی کتابیں پڑھیں، اپنے مطالعہ کو وسیع کریں اور اپنی فکر کو آگے بڑھائیں۔

علم و ادب کی روایت کو آگے بڑھانے اور چراغ سے چراغ جلتے رہنے کے لئے ضروری ہے کہ نئی نسلوں میں علم و ادب سے شغف پیدا کیا جائے اور جدید ادب کے ساتھ کلاسیکل ادب سے بھی ان کی دلچسپی باقی رکھی جائے، سرور صاحب نئی پود میں یہی روح پھونکنا چاہتے تھے، وہ اپنی تقریر و تحریر کے ذریعہ جہاں طلبہ کو علم و کمال کے حصول کی ترغیب دلاتے تھے، وہاں ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لئے بھی فکر مند رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے اساتذہ و طلبہ کو سب سے زیادہ ان سے فیض پہنچا اور انھوں نے اکثر ادیبوں اور نقادوں کو متاثر کیا۔

مضمون نگاری بھی کم سنی میں شروع کی تھی اور پھر مسلسل عمر بھر لکھتے رہے، ان کا اصل میدان ادبی تنقید تھا جس میں وہ اپنے ہم عصروں سے علانیہ ممتاز تھے، انھوں نے نظم و نثر دونوں پر جو تنقیدی مضامین لکھے وہ اردو میں بہترین تنقید کا نمونہ ہیں، شاعری میں مختلف اصناف سخن کے شعرا نے ان کو اپنی جانب متوجہ کیا، نثری تنقیدی مضامین میں بھی بڑا تنوع ہے افسانہ، ناول، تنقید، ترقی پسند تحریک، جدیدیت، متعدد اہل فن اور اشخاص پر بے شمار تنقیدی مضامین لکھے، اردو کی کئی اہم کتابوں پر ناقدانہ نظر ڈالی، مکتوب نگاری بھی

ان کی دلچسپی کا ایک موضوع تھا، ان کا مضمون "خطوط میں شخصیت" بڑی اہمیت کا حامل ہے، مہدی افادی اور اقبال کی مکتوب نگاری پر بھی قابل قدر مضامین لکھے اور غالب کے اردو خطوط کا ایک اچھا انتخاب "عکس غالب" کے نام سے مرتب کرکے شائع کیا۔

اقبال اور غالب کو وہ اردو کا بڑا شاعر مانتے تھے، ان پر خود بھی متعدد مضامین لکھے جو ان کے مضامین کے متعدد مجموعوں میں شامل ہیں، غالب کے خطوط کا انتخاب اور ان پر مختلف نقادوں کے مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کیا جو شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے شایع ہوا امتیاز علی عرشی کا مرتبہ دیوان غالب، مولوی مہیش پرشاد اور مالک رام صاحب کے مرتب کردہ خطوطِ غالب اور مختار الدین احمد صاحب کے مرتب کردہ مجموعہ مضامین "احوالِ غالب" اور "نقد غالب" انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیے۔ "ہماری زبان" اور "اردو ادب" میں ان پر اور اقبال پر متعدد مضامین شائع کیے اور مختلف موقعوں پر خود بھی ان میں مضامین لکھے۔

اقبال پر متعدد تنقیدی مقالے اس وقت لکھے جب ان کا نام لینا ہندوستان میں جرم سمجھا جاتا تھا، اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ہوکر سری نگر گئے تو ان پر کئی سمینار کرائے جن میں پڑھے جانے والے مضامین کے مجموعے اور اقبالیات کے ماہرین کے مقالات کے دوسرے مجموعے بھی انسٹی ٹیوٹ سے شائع کیے اور ان پر متعدد عالمانہ خطبات دئے۔

اس سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اردو تنقید میں ان کے کارنامے کمیت و کیفیت دونوں حیثیتوں سے اہم ہیں اور غالب شناسی اور اقبال فہمی میں ان کا پایہ بلند تھا۔

صحافت سے بھی ان کا تعلق رہا، اس کی ابتدا طالب علمی کے زمانے میں ہوئی جب علی گڑھ میگزین کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی تھی، انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ہوئے تو ہفت روزہ "ہماری زبان" اور سہ ماہی "اردو ادب" کی ادارت ان کے سپرد ہوئی جس کو برسوں

نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا، اردو ادب کے کئی اہم خاص نمبر بھی نکالے۔

اردو کی ترقی پسند تحریک کا آغاز سرور صاحب کے عنفوانِ شباب میں ہوا اور جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے تو اس تحریک کے شباب کا زمانہ تھا، ان کے تمام ترقی پسند ادیبوں سے گہرے روابط تھے۔ اسی لئے ان کا شمار ترقی پسند مصنفین اور ادیبوں کے زمرے میں کیا جاتا ہے بلکہ بعض ترقی پسند ادیبوں نے انہیں مارکسی نظریہ سے متاثر نقاد کہا ہے، لیکن جب یہ تحریک اضمحلال کا شکار ہوئی یا "جدیدیت" کے غلغلہ کے بعد اس کا زور و اثر کم ہوا تو سرور صاحب نے جدیدیت کا خیر مقدم کیا اور اس کے زیر اثر مضامین لکھے، اس موضوع پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں سمینار کرایا اور "جدیدیت اور اردو ادب" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا، جس میں مغرب میں جدیدیت کی روایت اور اس تحریک کے اہم پہلوؤں کا عالمانہ جائزہ لیا ہے اس میں "ادب میں جدیدیت کا مفہوم" کے عنوان سے ان کا بھی ایک مبسوط مقالہ شامل ہے، مگر جدیدیت کی تحسین و وکالت کے باوجود وہ اس ادبی نظریے سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے اور ترقی پسند تحریک کی طرح اس سے بھی کلی مفاہمت نہ کرسکے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ وہ ترقی پسند تحریک سے بیزار تھے اور نہ انہوں نے جدیدیت سے حذر کیا بلکہ انہیں ادب و تنقید کے مختلف النوع نظریات اور تحریکات سے اپنے کو ہم آہنگ کرلینے کا سلیقہ آتا تھا اور درمیانِ قعر دریا تختہ بند ہوکر دامن کو تر ہونے سے بچالینے کا ہنر معلوم تھا، ان کے مزاج و طبیعت میں اعتدال و توازن تھا، وہ ہر ایک سے مفاہمت کے باوجود کسی کے اندر ضم نہیں ہوتے تھے، بلکہ اپنی الگ پہچان اور علاحدہ شناخت بنائے رکھتے تھے، وہ جن افکار و نظریات سے متاثر ہوتے تھے ان سے مغلوب اور پسپا نہیں ہوتے تھے، وہ ادبی فوضویت اور انتشار سے بچنے کی تلقین کرتے تھے، مگر ادب میں گروہ بندی اور ادیب و نقاد کے مختلف خانوں میں منقسم

ہونے اور جدید و قدیم میں محصور ہو کر حقائق سے صرف نظر کر لینے کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کا یہ شعر اسی صورتِ حال کا ترجمان ہے ؎

کس کو سمجھائیں آج تسلسل حیات کا ۔۔۔ دیکھو جسے اسیر جدید و کہن میں ہے

ادب و تنقید کے علاوہ دوسرے موضوعات بھی ان کے قلم کی جولان گاہ رہے ہیں، علی گڑھ اور ہندوستانی مسلمان، مسلمان اور اسلام، اسلامی معاشرہ اور تہذیب پر بھی انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے ان کا اصل کمال ان کی تحریر کی دل کشی و دل آویزی ہے، موضوع کی خشکی کے باوجود وہ سلاست، شگفتگی اور روانی کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، ان کی تحریر ایچ پیچ اور تعقید و اغلاق سے پاک ہوتی تھی۔ موضوع کوئی ہوتا ان کی تحریر اور انداز بیان میں جلال و جمال موجود رہتا تھا۔

نقاد کی حیثیت سے سرور صاحب کو ایسی غیر معمولی شہرت نصیب ہوئی کہ اس کے سامنے ان کی دوسری حیثیتیں بالکل دب گئیں، حالانکہ وہ بڑے اچھے شاعر تھے، دس گیارہ برس کی عمر ہی سے شعر کہنے لگے تھے، سینٹ جانس کالج آگرہ میں ان کو شاعرانہ ماحول ملا، اس وقت آگرہ شعر و ادب کا مرکز تھا، بعض اساتذہ شعرا موجود تھے، اس ماحول نے ان کے شعری ذوق کو جلا بخشی، وہ مشاعروں میں شریک ہونے لگے اور ان کا کلام چھپنے لگا، علی گڑھ میں بھی ان کو شاعرانہ ماحول ملا، یہیں ۱۹۳۵ء میں ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "سلسبیل" کے نام سے چھپا، بعد میں ان کے دو مجموعے "ذوق جنوں" اور "خواب و خلش" شائع ہوئے۔

سرور صاحب نے غزلیں اور اشخاص و واقعات پر نظمیں کہی ہیں، وہ اپنے کو ذات و کائنات کا شاعر کہتے تھے، لیکن وہ شاعری سے بڑے کاموں کے لئے پیدا ہوئے تھے، چنانچہ جب ان کی مشغولیتیں بڑھیں اور تنقیدی مباحث کی جانب ان کو زیادہ توجہ کرنی پڑی تو شاعری کے لئے زیادہ وقت نہیں نکال سکے، مشاعروں میں جانا اور رسالوں میں کلام بھیجنا کم کر دیا ورنہ جس زور و شور سے

وہ شاعری کے کوچے میں وارد ہوئے تھے اگر یہ قائم رہ جاتا اور وہ شعر و سخن کو اپنا مشغلہ بنا لیتے تو جس طرح ادب و تنقید کو نیا انداز اور نیا لہجہ عطا کر کے اپنی عظمت کا لوہا منوایا ہے، اسی طرح اس میدان میں بھی گوئے سبقت لے جاتے، تاہم ان کی شاعری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں، ایک غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :۔

شانِ شہی نہ زلفِ شکن در شکن میں ہے ۔۔۔ وہ بانکپن جو منصبِ دار و رسن میں ہے

دشت و دمن میں پھول کھلائے تو بات ہے ۔۔۔ یہ کیا بہار ہے جو مقید چمن میں ہے

میرا لہو بھی کام کچھ آ ہی گیا ضرور ۔۔۔ شوخی بلا کی آج ترے پیراہن میں ہے

ہم انقلاب چاہیں تو بڑھ جائے کچھ جمود ۔۔۔ فتنہ گری نئی یہ سپہر کہن میں ہے

عرفان و آگہی کے تقاضے بدل گئے ۔۔۔ جادو عجیب اس نگہ سحر فن میں ہے

پگھلے گی اے سرور ہمالہ کی برف بھی
طوفاں تلاشِ گنگ و جمن میں ہے

ان اشعار کے تیور دیکھئے :

یہ لہو جس میں تب و تابِ نفس ہے میرے ۔۔۔ دیکھ ایوانِ حکومت میں چراغاں نہ بنے

لوگ ہر شمع کو فانوس بنا دیتے ہیں ۔۔۔ شعلہ اپنا بھی چراغِ تہہ داماں نہ بنے

رگِ ہر سنگ میں جو لعل و گہر بنتا تھا ۔۔۔ وہ شرارہ بھی کہیں شمعِ شبستاں نہ بنے

موج خوں رقص تھی ہر گام پہ طوفانِ تخلیق ۔۔۔ کسی گلزار کی اک جوئے خراماں نہ بنے

چند اور شعروں کی معنویت اور شاعر کے احساس و تخیل کی بلندی پر غور کیجئے !

ہند کے جلوۂ صد رنگ کا ہے پاس ضرور ۔۔۔ اس میں سوزِ عرب و حسنِ عجم یاد رہے

کارواں منزلِ نو کے لئے ہو سرگرمِ سفر ۔۔۔ اپنی تہذیب کا بھی نقشِ قدم یاد رہے

چمنِ علم و ادب میں نئی کلیوں کے حضور — میر و غالب کے شگوفوں کا بھرم یاد رہے

علی گڑھ سرور صاحب کا خاص مرکزِ عقیدت تھا، اس سے ان کا رشتہ صرف ملازمت کا نہیں تھا بلکہ اس سے ان کو ذہنی و جذباتی لگاؤ تھا، وہ اس سے وابستہ افراد سے یہ چاہتے تھے کہ اس کے مفاد پر اپنا مفاد قربان کردیں، اسے صرف جاہ و منزلت کا ذریعہ نہ بنائیں، اس سے صرف لینے کی فکر میں نہ رہیں بلکہ اسے دینے کے لئے بھی آمادہ ہوں، جو لوگ یونی ورسٹی کے ذمہ دارانہ مناصب پر فائز ہوں وہ اس کے عظمت شناس، اس کی روایات و خصوصیات سے واقف، تعلیم کے ماہر اور تعلیمی مسائل کو سمجھنے والے ہوں۔

وائس چانسلر محمد حامد انصاری کے بقول "سرور صاحب ان ہستیوں میں سے تھے جن کی وجہ سے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کو پہچانا جاتا تھا"۔ علی گڑھ کے نام ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

اے کہ کرنوں سے تری اپنے سیہ خانے میں — چاند کا نور ستاروں کی چمک باقی ہے
لالہ کاروں سے تری بادِ خزاں کے باوصف — اپنے ویرانے میں پھولوں کی مہک باقی ہے
کون سمجھے ترے پُر سوز تخیل کے سوا — اب بھی ہر خاب میں شعلوں کی لپک باقی ہے

وہ سرسید کو عظیم و جلیل شخص سمجھتے تھے اور اس سے متفق نہیں تھے کہ سرسید کو مغرب کی ہر چیز اچھی اور اپنی ہر چیز بدتر دکھائی دیتی تھی، انہیں اپنا مذہب عزیز تھا، اس پر حملہ ہوتا تو تڑپ اٹھتے، وہ اس سے متفق نہ تھے کہ سرسید انگریزوں کے آلہ کار تھے، ان کا کام مسلمانوں کو غلامی پر راضی کرنا تھا بلکہ وہ وقت کی نبض کو پہچانتے تھے اور دیکھتے تھے کہ مغرب ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا تھا، وہ اس سے واقف تھے کہ مغرب نے سائنس کی مدد سے علمی سرمایے میں اضافہ کیا ہے، وہ مغرب کے تہذیبی کارناموں سے آنکھیں بند کرنے کے بجائے ان سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

سرور صاحب شریف، وضع دار اور خلیق انسان تھے، ان کی طبیعت میں دردمندی، ضبط و تحمل اور حلم و بردباری کے ساتھ شگفتگی اور زندہ دلی تھی، جلدی طیش و اشتعال میں نہ آتے، ان کو کسی سے عداوت اور نفرت نہ تھی، اپنے مخالفین کی باتیں سن کر پی جاتے اور غصہ نہ ہوتے، شاہ معین الدین صاحب کہتے تھے کہ انجمن ترقی اردو کے جلسوں میں بعض لوگ بڑے سخت اور ناگوار لب و لہجہ میں جا و بے جا اعتراضات کرتے تھے مگر غصہ تو درکنار ان کی پیشانی پر شکن بھی نہیں آتی تھی اور جب موقع آتا تو نرم و شیریں انداز سے سارے اعتراضات کا ایسا جواب دیتے کہ سب لوگ ٹھنڈے ہوجاتے۔

چھوٹوں سے بڑی شفقت کا برتاؤ کرتے، کبھی ان کی دل شکنی نہ کرتے، اپنے شاگردوں کی ہمیشہ دل جوئی اور حوصلہ افزائی کرتے، ان کی تحریروں کی تحسین کرکے ان کی ہمت بڑھاتے مگر بڑے اصول پسند اور قاعدے ضابطے کے پابند تھے، وظائف اور داخلوں کے معاملے میں کوئی رو رعایت نہیں کرتے تھے، کسی طالب علم کا نمبر بڑھانے یا کسی شخص کے تقرر کے معاملے میں وہ کسی کی سعی و سفارش قبول نہیں کرتے تھے۔ صرف اہلیت و صلاحیت ہی کو معیار بناتے تھے، بعض لوگ امیدوار یا داخلے کے خواہش مند کی غربت یا مذہب و قومیت کا حوالہ دے کر اس کے لئے ہمدردی کے طالب ہوتے تھے، مگر وہ بلا تامل معذرت کردیتے تھے۔

اوقات و معمولات کے پابند تھے، کثرتِ کار اور مشاغل کی زیادتی کی بنا پر ان کو بزم و انجمن آرائی کے لئے وقت نہ ملتا تھا، رات اور صبح کا وقت مطالعہ و تصنیف کے لئے وقف تھا، اس میں اگر کوئی آجاتا اور خلل انداز ہوتا تو بڑی ناگواری ہوتی تھی۔

سرور صاحب کی گوناگوں علمی، ادبی اور تنقیدی خدمات کی بڑی پذیرائی ہوئی، مختلف ریاستوں کی اردو اکیڈمیوں نے انہیں اپنے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا، ساہتیہ اکاڈمی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے اعزاز بھی ان کو ملے۔ حکومتِ ہند نے پدم بھوشن اور صدر پاکستان نے طلائی تمغہ دے کر ان کی عزت افزائی کی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انہیں عالمِ آخرت کے بلند مدارج عطا کرے۔ آمین!!

مطبوعات جدیدہ

حجۃ الوداع وجزء عمرات النبیؐ (عربی) از مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

تخریج و تعلیق ڈاکٹر ولی الدین تقی الدین ندوی، قدرے بڑی تقطیع، بہترین کاغذ، وطباعت، مجلد، صفحات ۴۱۲، قیمت درج نہیں، پتہ : وزارۃ العدل والشئون الاسلامیہ والاوقاف ابوظبی، یو، اے، ای۔

سیرت طیبہ میں حجۃ الوداع کی دینی، تبلیغی اور تاریخی اہمیت کے پیش نظر ارباب سیر نے اس سے خاص اعتنا کیا، ابن حزم، طبری، ابن قیم، ابن کثیر اور قسطلانی و زرقانی جیسے ائمہ، مشاہیر نے خاص طور پر اپنی کتابوں میں مستقلاً اس کا ذکر کیا، لیکن اس کے باوجود اس باب میں تشنگی کا احساس رہا، محدث شہیر مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی نگاہ تحقیق اس گوشے پر پڑی تو انھوں نے حافظ ابن قیم کی بحث کو بنیاد بنا کر ان کے متن کی شرح اس طرح کی کہ اس میں حج کے متعلق تمام مضامین مختلف مسالک، محدثین و فقہا خصوصاً فقہ میں ائمہ اربعہ کے اقوال، تاریخی مباحث اور ائمہ متقدمین کی کتابوں کے مفصل جائزے کے علاوہ اس زمانہ جدید تحقیقات بھی پیش کر دیئے گئے اور نبی کریمؐ کے جملہ حج، حج کی فرضیت، کاروان حجۃ الوداع میں صحابہ کرامؓ کی معیت و شرکت سے مدینہ منورہ واپسی تک ہر جزئیے کا استقصا اس طرح کیا گیا کہ جامعیت و انفرادیت میں یہ کتاب اپنے موضوع پر انسائیکلوپیڈیا قرار دی گئی، حضرت شیخ کی تحقیقی بصیرت نے ابن قیم کے بعض خیالات کی اصلاح بھی کی، مثلاً ہدی تطوع اور رمل فی السعی وغیرہ، خوبی مستزاد یہ بھی

کہ حجۃ الوداع کے علاوہ عمرہ حدیبیہ، عمرہ قضا، عمرہ جعرانہ وغیرہ نبی کریمؐ کے عمرات کے متعلق بھی ایک مفصل اور جدا بحث کتاب میں شامل کر دی گئی جس کی تکمیل کا اشارہ بلکہ بشارت ان کو حالت منام میں حاصل ہوئی، آخر میں ایک مختصر باب شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمن اعظمی کا مرتب کردہ خطبات النبیؐ پر ہے جس سے قدر و افادیت بیش از بیش ہوگئی، کتاب ہند و بیرون ہند سے کئی بار طبع ہوئی، تاہم عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق تخریج و تعلیق اور شایان شان طباعت کی ضرورت تھی، یہ سعادت بھی ہندوستان کے ایک سعید و صالح نوجوان ندوی عالم کے نصیب میں آئی جنھوں نے مطبوعہ نسخوں کے مطبعی اغلاط کی تصحیح، مشکل اور غریب الفاظ و عبارات کی توضیح کے علاوہ احادیث و آثار کی تخریج اور ان کے فنی مقام کی تعیین بڑی محنت اور سلیقے سے کی، مضامین کے عنوان بھی قائم کئے جس سے استفادہ اور آسان ہوگیا، لائق محقق کی اس محنت کی داد امارات العربیہ کے وزیر عدل محمد نخیرہ الظاہری نے بھی دی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد یوسف بنوری رحمہما اللہ کے کلمات تقدیم سے بھی یہ کتاب آراستہ ہے۔

وصی میڈیکل ڈکشنری (انگلش-اردو) از جناب مولانا حکیم

عزیز الرحمن اعظمی، بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۵۴۸، قیمت درج نہیں، پتہ : مکتبہ فردوس، مکارم نگر (برولیا) ٹیگور مارگ، لکھنؤ۔

علم و فن طب کے ہر شعبے سے متعلق انگریزی اصطلاحات کو جمع کرنا بجائے خود بڑا کام ہے اور اردو میں ان کا ترجمہ تو یقیناً ایک کارنامہ ہے جس کی توقع ماہرین فن

کی ایک جماعت سے ہی کی جاسکتی ہے، لیکن حیرت ہے کہ یہ عظیم الشان کارنامہ اس لغت کے فاضل مرتب و مترجم نے تن تنہا انجام دیا۔ قریب اکتالیس ہزار الفاظ اور ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل یہ لغت ان کی غیر معمولی محنت اور ترجمہ کی لیاقت کا عمدہ نمونہ ہے، اس سے پہلے عربی اور انگریزی کی متعدد کتابوں کو وہ اردو قالب میں منتقل کرچکے ہیں، جن میں بعض طبی موضوعات پر ہیں، اب اس ترجمہ کی فنی خوبیوں کا اعتراف بھی ماہرین فن نے کیا ہے، اکثر اصطلاحات پر عربی و فارسی زبان کا گہرا اثر ہے، مطران شللی، کوکلہ بحری، ضعف تقلب انحرانی، خراج قرنی، مصاص سببی، اعتقال اطراف، تیلہ غدہ لمفاوی، سلع غدی غضروفی جیسی اصطلاحات سے واقفیت کے لئے موجودہ اردو داں طبقہ کی عربی و فارسی صلاحیت بھی اعلیٰ درجہ کی ہونی چاہئے، اصطلاحات کی زبان جدا ہوتی ہے لیکن یہ قریب الفہم ہوئیں تو افادیت سوا ہوسکتی ہے، اس کے لئے ماہر مترجمین و واضعین اصطلاحات کی ایک جماعت شاید ضروری اور موثر ہو ABSOLUTE ALCHOHAL کا ترجمہ الکوحل صافی سے کیا گیا ہے، خالص الکوحل شاید زیادہ زود اثر ہوتا۔

حکیم صاحب نے انتساب اپنے نادیدہ ممدوح جناب سید حامد سے کیا ہے، حکیم ضیاء الرحمن ضیاء سابق پرنسپل طبیہ کالج لکھنؤ اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی مختصر تعارفی تحریروں کے علاوہ پروفیسر حکیم ظل الرحمن کے قلم سے عالمانہ پیش لفظ بھی ہے۔ اس مہتم بالشان طبی و علمی خدمت کے متعلق یہ خیال بالکل درست ہے کہ "یہ کارنامہ بقائے دوام حاصل کرے گا اور دنیائے علم و فن کا ایک شاہکار سمجھا جائے گا۔"

ع۔ ص۔